آدھے ادھورے

آدھے ادھورے

خورشید عالم

ادھے ادھورے

تزئین : اختر انصاری
سرورق : نورالحسن انصاری
مطبع : نکھار پریس، مئو
قیمت : پندرہ روپے Rs.15/-

طبع اول : ۱۹۸۲ء
تعداد : ایک ہزار
سلسلۂ مطبوعات : (۱۵)

مصنف کا پتہ
۶/۴۳ سمیع ہاؤس، مالویا روڈ۔ دیوریا

تقسیم کار
نکھار پبلیکیشنز مئو ناتھ بھنجن (یوپی)

ملنے کے پتے :- کتاب منزل۔ تاتارپور روڈ۔ بھاگل پور (بہار)
نفیس بک ہاؤس۔ جامع مسجد۔ دیوریا (یوپی)

* یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی۔
* اس کتاب کے مندرجات سے یوپی اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

والدِ مرحوم کے نام ______

ترتیب

پیش گفت

پچھلے چند برسوں میں بعض رسائل میں خورشید عالم کے افسانے پڑھے تو یقین نہیں آیا کہ ایسی صلاحیت اور اپج رکھنے والا نوجوان آزادی کے بعد، اتر پردیش میں جنم لے سکتا ہے۔ اس لیئے کہ اس ریاست میں اردو کے دشمنوں اور دوستوں ــــــ دونوں نے، اس زبان کے تعلق سے بیگانگی، بے مہری اور بیزاری کی ایک ایسی فضا پیدا کردی ہے جسمیں کسی نئے تخلیق کار کے پیدا ہونے اور پنپنے کے امکانات مفقود سے ہو گئے ہیں۔ یہ صورت حال بہار، مدھیہ پردیش، آندھرا یا دوسری ریاستوں پر نہیں ہے۔ جہاں اردو کے بہی خواہ اور ادارے ایک واضح لائحہ عمل کے ذریعہ نوعمر ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

خورشید عالم کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ایک ایسے وقت میں شائع ہو رہا ہے جب اردو کے باذوق قارئین کی اکثریت نام نہاد، علامتی اور تجرباتی افسانوں سے بیزار اور اردو افسانہ کے مستقبل سے مایوس ہو چکی ہے۔ کہانی جو اپنی افسانویت اور حیات آموز پیکر تراشی سے قاری کو اچھوتے اہتزاز کی دولت بخشتی تھی۔ اپنے اس منصب سے بڑی حد تک محروم کردی

گئی۔ آٹھویں دہائی میں جن نوجوان افسانہ نگاروں نے اس کے ان اوصاف کو بحال کرنے اور اسے ایک نئی جمالیاتی معنویت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ان میں خورشید عالم کا نام بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

اس مجموعہ میں جو کہانیاں شامل ہیں ان میں احساس و فکر کی تازگی کے ساتھ ساتھ قارئین کو تخلیقی رویّوں کے تنوع کا احساس بھی ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہانیاں داخلیت پسندی کی اس گھٹن، تکرار اور یکسانیت سے پاک ہیں جو جدید افسانہ کا شناختی نشان بن گئیں۔ اس کے باوجود یہ کہانیاں داخلی تحریک، دردمندی اور جاں سوزی کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں عشق بلاخیز کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے اور پُرآشوب ماحول کا آسیبی احساس بھی۔ انسان کے باطنی وجود کی پُراسرار حقیقتیں بھی اور عصری زندگی کو زیروزبر رکھنے والی قوتوں کی آگہی بھی۔ الغرض یہ کہانیاں فرض کی ذات اور اس کے ماحول کے درمیان مغایرت آویزش اور ہم آہنگی کے ایسے گوشوں کی تلاش سے عبارت ہیں جہاں نئی انسانی قدروں کی کونپلیں ہمکتی دکھائی دیتی ہیں۔

مثال کے طور پر "لمحے کا توازن" انسان کے لطیف اور نازک احساسات کے ریشمی تاروں سے گندھی ہوئی کہانی ہے۔ ایک کیف آفریں حسیاتی تصادم کہانی کے واحد غائب کے داخلی وجود کا سارا ہیولیٰ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اسی طرح "عمر کی دہلیز پر" کی مدھو بھی ایسے ہی معصوم تجربہ سے گذر کر اپنے وجود میں ایک دبی لیکن لذت آفریں ہلچل محسوس کرتی ہے۔ خورشید عالم نہایت معمولی بلکہ پامال جذباتی واردات سے کہانی تراش لینے کا ہنر جانتے ہیں۔

اپنی کہانی "روشنی کا درد" میں انھوں نے فنکار کے جس مسلک کی طرف اشارہ کیا ہے خود ان کی کہانیاں اس سچائی کی خاموش گواہ ہیں۔ فنکار اپنی تخلیق سے، لمحہ بھر کو سہی، ایک ایسی روشنی خلق کر دیتا ہے جو ریاکاری بدباطنی اور خود پرستی کے اندھیروں میں انسان کو برہنہ کر دیتی ہے۔ "بکھرا ہوا چہرہ" میں مرکزی نقطہ گم شدہ چہرہ نہیں بلکہ ریاکاری اور مفاد پرستی کا وہ گھناؤنا ماحول ہے جو انسان کو بحیثیت انسان اپنی شناخت سے محروم کر دیتا ہے۔

خورشید عالم کی وہ کہانیاں بھی جاندار ہیں جو اردگرد کی زندگی اور دبے کچلے انسانوں سے ان کے دردمندانہ رشتوں کی معنویت کو جتاتی ہیں مثال کے طور پر "چاندنی رات کے مےخوار" یہ ان پیشہ ور بھک منگوں کی کہانی ہے جو بظاہر اپنے انسانی وقار، عزت، غیرت اور احساس نفس سے دست بردار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی اپنے وجود کی جو دنیا ہے وہ ویسے ہی انسانی جذبات اور خواہشات کی حامل ہے جیسے کہ دوسرے انسان رکھتے ہیں۔ ان کا دل بھی احساس جمال کی ایک میزان رکھتا ہے جس پر وہ اپنے فیصلوں کو تولتے ہیں۔ محرومیوں کے کرب سے ان کا دل بھی لہو ہوتا ہے۔

اس انداز کی متعدد کہانیاں اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

خورشید عالم نے فیشن پرستی اور تقلید سے بڑی حد تک آزاد ہو کر، ایک ایسی خود اعتمادی سے یہ کہانیاں لکھی ہیں جو اپنے تجربات سے اور ان موضوعات سے جنھیں ترجیحی طور پر انھوں نے برتا ہے ان کی گہری وابستگی کا احساس دلاتی ہیں۔ اپنی واردات اور اپنے مواد کے تئیں یہ خلوص ہی حقیقی فن کار کا زادِ راہ ہوتا ہے۔ وہ نوجوان جو مروجہ فارمولوں اور بدلتے

ہوئے فیشنوں کو سامنے رکھ کر چونکا دینے والی کہانیاں گڑھنے کا ' ہنر ' دکھاتے ہیں ' اپنے سفر کی پہلی منزل پر ہی ہانپنے لگتے ہیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ اس مجموعہ میں شامل ساری کہانیاں فن اور ٹکنیک کے لحاظ سے مکمل اور معیاری ہوں ۔ بلاشبہ بعض کہانیاں اور ان کے بعض حصّے خام اور کمزور بھی ہیں جسکی وجہ سے ان کا مجموعی تاثر تیکھا اور دیرپا نہیں ہوتا لیکن ادبی سفر کی پہلی منزل میں کون سا ایسا فنکار ہے جس کا فن کوتاہیوں سے یکسر پاک ہو ۔ دیکھنا یہی ہوتا ہے کہ تخلیقی اظہار کے جس فارم یا وسیلہ کو اس نے اپنایا ہے اس میں کچھ نئے گوشے ، نئے ابعاد پیدا کرنے کی صلاحیت وہ رکھتا ہے یا نہیں ؟ اس لحاظ سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ کہانیاں ان کے تابناک مستقبل کا اشاریہ ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ ان کا دوسرا مجموعہ نہ صرف ان کے منفرد فنی اسلوب کا اشاریہ ہوگا بلکہ اردو افسانہ کے مستقبل پر ہمارے اعتماد کو بھی استحکام بخشے گا ۔

ڈاکٹر قمر رئیس

C/166 ، وویک وہار ۔ دلّی ۱۱۰۰۳۲

فن اور فنکار

یوں تو خورشید عالم صاحب کے کئی افسانے نظروں سے گذر چکے تھے لیکن پہلی بار ان سے مئو میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں، جو پہلی ہی نظر میں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں۔ خورشید عالم صاحب کی نوجوان شخصیت بھی کچھ ایسی ہی نظر آئی۔ گفتگو کے دوران یہ اندازہ کرلینا مشکل نہ تھا کہ متناسب قد وقامت اور پرکشش رنگ وروپ والا یہ نوجوان نہ صرف زیادہ سوچنے کی حد تک سنجیدہ ہے بلکہ اس کے اندر چھپا ایک فنکار نہ باہر آنے کے لئے مضطرب ہے۔

اردو افسانے کی تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے۔ سوسال سے کم عرصے میں اردو افسانے کو مختلف مرحلوں سے گذرنا پڑا ہے۔ داستان گوئی سے افسانے کی منزل تک پہنچنے میں انگنت افسانہ نگاروں نے اپنے نقش قدم چھوڑے ہیں اور انگنت اس منزل کی طرف گامزن ہیں جہاں پہنچ کر فنکار اپنا نقش ابھارتا ہے۔ خورشید عالم صاحب بھی انھیں میں سے ایک فنکار ہیں۔

خورشید عالم کے افسانوں نے مجموعی طور پر جو تاثر قائم کیا ہے

وہ جہاں انفرادی سطح پر ان کے الگ رنگ، انداز، زاویۂ نگاہ اور زبان و بیان کی سطح پر ذاتی اسالیب کی نشان دہی کرتا ہے وہیں اس سے افسانہ نگار کی حیثیت سے اس صنف کی ارتقا میں ان کے کارہائے نمایاں کا پتہ چلتا ہے۔

خورشید عالم انسانوں کی بے بسی، محرومی اور نامرادی کا شدید احساس رکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے ان کے افسانوں میں درد و کرب، ٹیس اور جلن کی شدت زیادہ نظر آتی ہے۔ یہ جہاں اپنے افسانوں میں سنگین سے سنگین واقعات و حالات کو نہایت شگفتہ و موثر انداز بیان کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہیں تصنع اور خواہ مخواہ کہانی گڑھنے کی کوشش سے منحرف بھی نظر آتے ہیں۔

خورشید عالم اپنے افسانوں کے لئے خام مال و مواد اپنے آس پاس سے لیتے ہیں اس لئے آپ کے افسانوں میں حقیقت اور سچائی کھل کر سامنے آتی ہے۔ ان کے شستہ و شگفتہ انداز بیان کے ساتھ گاہے گاہے دکھتی رگ پر انگلی رکھ دینے کی عادت بھی انھیں اپنے ہمعصروں میں نمایاں کرتی ہے۔

خورشید عالم کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد ان کی صلاحیتوں اور افسانہ نگاری پر ان کی گرفت مضبوط ہونے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مجموعہ میں شامل افسانہ "عمر کی دہلیز پر" افسانہ نگار کی فنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ پلاٹ سے قطع نظر افسانوی تکنیک کے اعتبار سے یہ افسانہ تاثرانگیز ہے۔ مدھو کے سوچنے کا خوبصورت و پرتجسس انداز معصوم مکالموں اور پھر جھنجھلا جانے کے حسین انداز نے افسانے کے

حسن میں اور اضافہ کر دیا ہے اور اختتام پر مدھو کا بے نقاب ہو جانا، محبت کے جذبے سے سرشار ہو جانا ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

خورشید عالم کے زیرِ نظر مجموعہ میں ایسے افسانے بھی شامل ہیں جنھیں نئے افسانے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پلاٹ اور مواد سے قطع نظر نئے افسانے کو کلاسیکی افسانے کی تکنیک کی سطح سے الگ نہیں کیا جا سکتا "کھویا ہوا چہرہ" "روشنی کا درد" "آدھے ادھورے" جدید تکنیک میں لکھے ہوئے خوبصورت افسانے ہیں جو انسانی مسائل، ذہنی کشمکش، ناآسودگی اور سماجی انتشار کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ "شعور کی رو" کی تکنیک پر لکھے گئے افسانے، افسانہ نگار کا اپنا وضع کردہ انداز نہیں بلکہ انسان کی ذہنی شناخت اور اس کا اظہار ہے جو کبھی ایک مرکز پر نہیں ٹھہرتا۔

مختصر یہ کہ خورشید عالم کے افسانوں کے پس منظر سے ایک ایسے افسانہ نگار کی شبیہہ ابھرتی ہے جس کا مستقبل شاندار اور روشن ہے۔

خورشید عالم یقیناً اس حقیقت سے واقف ہیں کہ دوسروں کی تقلید کرنے والے کبھی اپنا نقش نہیں چھوڑتے۔ آپ کا فن رُوبہ ارتقا ہے اور یہ اس منزل کی طرف گامزن ہیں جہاں پہنچ کر فنکار اپنا نقش ابھارتا ہے۔

شاکر کریمی
گنج ۱۰، بتیا۔ (چمپارن)

فنکاروں کی نظر میں

جدید اردو افسانے میں علامتی اور تجریدی رجحان دورِ حاضر کی اس فرسٹریشن کی دین ہے، جو آج کے انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ مغربی اور مشرقی تہذیبوں کے ٹکراؤ نے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری سماجی زندگی ہوا میں لٹک گئی ہے ہم نہ تو مشرقی ہی رہے ہیں اور نہ مغربی بن سکے ہیں۔ قدروں کا ٹوٹنا ایسے دور کا فطری عمل ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اردو کے افسانہ نگاروں نے ان ٹوٹتی ہوئی سماجی قدروں کے کرب کو بڑی شدّت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ یہ کسک خورشید عالم کے افسانوں میں بھی موجود ہے۔

خورشید عالم کے ان افسانوں میں بھی جن میں رومان غالب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے، آج کے دور کے تنہا پڑے انسان کے جذبات و احساسات ابھر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رومان کے دھارے میں بہنے کے بجائے قاری اس المیہ سے دوچار ہوجاتا ہے، جسے ہم 'ذات کا المیہ' کہہ سکتے ہیں۔ استعاروں اور علامتوں کے استعمال میں بھی خورشید عالم اپنے افسانوں کو اس ابہام سے پاک رکھنے میں کامیاب ہیں، جس کا شکار اکثر

نئے افسانہ نگار ہو جاتے ہیں۔

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ وہ اپنا افسانوی مجموعہ شائع کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ مجموعہ مقبول ہوگا۔

ڈاکٹر نربش
پنجاب یونیورسٹی، ایوننگ کالج چنڈیگڑھ

•

خورشید عالم ایک نئے ابھرتے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے پاس تانگی ہے، رومانوی چاشنی ہے اور ایک خوبصورت انداز بیان بھی۔ انکے ہاں سنجیدگی بھی ہے اور ہلکا سا تبسّم پیدا کرنے والا مزاح بھی۔ ان کی تحریر زندگی کی منزلوں کے ساتھ ساتھ فن میں مزید ترقی کا یقین دلاتی ہے، اور یہ سب چند گنے چُنے افسانہ نگاروں کے بارے میں ہی کہا جا سکتا ہے۔

ستیش بترا
سیکٹر ۲۰۵/۸، ۱۴۰۸ فرید آباد۔ ۱۲۱۰۰۲

•

نوجوان خورشید عالم نے حال ہی میں اردو افسانہ کی دہلیز پر قدم رکھا ہے۔ بہت آہستگی کے ساتھ، لیکن ایسے چونکا دینے والے انداز میں کہ دور دور کے اردو ایوانوں میں ان قدموں کی چاپ سنی گئی ہے۔ اردو کا سنجیدہ قاری بڑی توجہ سے ان کی تخلیقات پر متواتر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ہماری موجودہ نسل کے وہ ایسے فنکار ہیں جو مختصر افسانوں کے ذریعہ وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو دلوں میں مانند نشتر پیوست ہو جاتی ہیں۔ دوسروں کو ان تلخ حقائق کو کہنے کے لئے متعدد صفحات درکار ہوتے ہیں۔

لیکن خورشید عالم کا طرز بیان بے حد مختصر اور جامع ہے۔ وہ اشاروں کنایوں میں دبی ہوئی راکھ کی چند چنگاریوں کو ہوا دے دیتے ہیں اور بلیغ کام قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان سے شمع ادب کو جلا کر اپنے دل کے حریم میں چراغاں کرلے۔

"اس کی پسند" ایک بے حد خوبصورت نفسیاتی افسانہ ہے۔ جسمیں ایسی ادھیڑ عمر عورت کے ذہن کے دریچوں پر دستک دی گئی ہے جو اپنے سے کم عمر ایک طالب علم کی جانب مائل ہوجاتی ہے۔ "کھویا ہوا چہرہ"۔ "عمر کی دہلیز پر" "احساس" اور "روشنی کا درد" ایسے علامتی افسانے ہیں جن کے ذریعہ قاری کو اپنے تحت الشعور میں جھانکنے کا موقعہ فراہم ہوتا ہے۔ ادراک پر مسلط دبیز کہر ہٹتی ہے۔ ذہن کے آگے گہری دھند چاک ہوتی ہے اور تب قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ افسانوں کا مرکزی کردار کوئی اور نہیں، وہ خود ہے ـــــ اس کی اپنی ذات ہے۔ اگر دوسرے ہیں بھی تو اس نے پہلی بار ان بکھرے ہوئے کرداروں کو اکٹھا کرکے توجہ سے پرکھا ہے۔ ان کی زندگی میں اس حد تک جھانک کر دیکھا ہے کہ ان کا درد اب اپنا درد معلوم ہونے لگا ہے۔

خورشید عالم تارکی زبان میں لکھنے کے عادی ہیں۔ کم الفاظ میں طویل بات کہہ جانے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ بات بھی وہ جو سیدھی دل پر اثرانداز ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ افسانوی مجموعہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور پسند کیا جائے گا۔

سراج انور
ایشیا فوٹو اسٹوڈیو۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

●

حروف میں زندگی کی بازآبادکاری کے عمل کی کاوش سے ہی فکشن میں وہ خوبیاں ابھر کر آتی ہیں جنکی بدولت اسے فنونِ لطیفہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ بہ الفاظ دِگر کہانی کار اپنی کہانی میں چند مفروضوں کو کسی مخصوص ہیئت میں نہیں بٹھا رہا ہوتا، بلکہ اس کی واردات اپنے مخصوص تقاضوں کے عین مطابق ہیئت پذیر ہو رہی ہوتی ہے ـــــ مسرّت کا مقام ہے کہ خورشید عالم بھی اپنی دریافت کے حالیہ عمل میں ایسے ہی رویّوں کی دشواریوں سے دوچار ہے۔ انہی دشواریوں کا شعور، تخلیق کاروں کو اپنی فنی مشکلات پر حاوی ہوتے رہنے کا ملکہ عطا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خورشید عالم اور نئی نسل کے ایسے ہی دوسرے باضمیر لکھنے والوں کی متجسس اور باہم شرکتوں کے باب سے ہماری کہانی کے سفر کا سامان ہوتا رہے گا اور شاہراہوں کی گہماگہمی ٹوٹنے میں نہ آئے گی۔

جوگندر پال

۵۸۷۔ گریٹر کیلاش II، نئی دلی۔

اِک ذرا سی بات پر

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا........ کہیں کوئی نہیں ہے۔
بس سورج ڈھل رہا ہے اور اس کی روشنی سوچ کو پگھلا رہی ہے۔ موم کی طرح۔ کوئی احساس باقی نہیں ہے۔ اس کی زندگی جس تپتے ہوئے سنسان صحراہیں گذر رہی تھی اس کو روحی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ دریا کے ساحل پر کھڑا ہو کر بھی وہ پیاسا ساتھا۔ اس کی تمناؤں کی ساری کلیاں اس کے غم کی آنچ سے جھلس چکی تھیں۔ فطرت نے جیسے اس کی زندگی کو خوشیوں، مسرتوں اور پیار بھیں سے کچھ بخشا ہی نہ ہو۔ ساری رات ارشد سو نہ سکا۔ پانچ برس پہلے کالج میں روحی کے ساتھ گذرے ہوئے رومان پرور دن اس کی آنکھوں میں گھومتے رہے۔ یوں تو ایک لمحہ بھی اس نے اپنے وجود کو روحی سے الگ نہ سمجھا تھا۔ پھر بھی روحی کو اتنی مدت کے بعد دیکھ کر اسکے چہرے کی اداسی اور آنکھوں کی گہرائی دیکھ کر وہ اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو رات کی تنہائی میں اسے دیر تک رلاتے رہے۔ آج اتنے عرصہ کے بعد اسے محسوس ہوا اسے روحی کو چھوڑ کر نہ جانا چاہئے تھا۔ لیکن ــــــ لیکن یہ دنیا، یہ سماج، اس کے دستور، رسم و

رواج ۔

ـــــــ ارشد اور روحی نے کالج میں دو سنہرے برس ساتھ ساتھ بتائے اس عمر میں انھیں علم کی پیاس تھی ۔ ہر کلاس میں وہ ایک دوسرے سے زیادہ نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے ۔ بحث مباحثے میں وہ ایک دوسرے سے آگے تھے ۔ زندگی کی اس دوڑ نے انھیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا اور قربت کا ایک ایسا مقام بھی آیا جہاں وہ ایک دوسرے کو والہانہ طور پر جاننے لگے ۔ روحی کا خاندان بہت بڑا تھا ۔ سبھی لوگ بہت پڑھے لکھے تھے وہ اچھے خاندان اور اچھے خون کو مانتی تھی ۔ اس دن کلپنا ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ارشد نے روحی سے بہت سی باتیں کیں ۔ اسی دن روحی نے ارشد کو اپنی نم روشن آنکھوں سے آنے والی زندگی کے سنہرے خواب دکھائے ۔ وہ شام اس کی زندگی کی تاریخی شام تھی ۔ اپنی تنہائیوں میں ہزاروں لاکھوں بار ارشد نے اس شام کی نسبت سوچا تھا ۔ شاید اسی شام کے لئے اس نے جنم لیا تھا ـــــ اسے یاد ہے اس دن روحی نے کہا تھا کہ وہ ایک آئی اے ایس افسر بنے گا اور پھر وہ اس کی شریکِ حیات بن کر اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دے گی ۔ اس دن مسکراتے ہوئے ارشد نے اس سے پوچھا تھا :

"اور میں آئی اے ایس افسر نہ بن سکا تو ۔۔۔؟" "تو کیا ؟ میں تمھیں کبھی نہ پا سکوں گی ۔ میری خواہش ہے کہ میں ایک آئی اے ایس افسر کی بیوی کہلاؤں اور اگر تم آئی اے ایس افسر نہ بن سکے تو میرے گھر والے بھی کبھی تیار نہ ہوں گے ۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو روحی ؟" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا ۔

"نہیں ارشد ! میں نے تو یوں ہی تمھیں چھیڑنے کے لئے کہہ دیا تھا ۔ میں

ہمیشہ تمہاری رہوں گی چاہے تم جیسے بھی ہو گے ۔"

"روحی! کبھی کبھی یوں ہی کہی ہوئی باتیں بھی سچ ہو جایا کرتی ہیں ۔"

ارشد اکثر سوچتا ـــــ اگر وہ شام اس کی زندگی میں نہ آتی تو اس کی دکھی اور ویران زندگی کا کیا مقصد ہوتا۔ وہ کیسے پہاڑ جیسی لمبی عمر کاٹتا۔ رومان پرور اور مسرتوں کے وہ سنہرے دن پر لگا کر اڑتے گئے۔ ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا۔ روحی کے گھر والوں کو جب پتہ چلے گا کہ روحی جس کی شریکِ حیات بننے کا خواب دیکھ رہی ہے وہ ایک معمولی گریجویٹ ہے جو اس کی فیملی میں کسی طرح ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا تو وہ اسے ہرگز قبول نہ کریں گے۔ زندگی کے جس فلسفے اور مقصد کے ساتھ روحی جینا چاہتی ہے اس فلسفے کی منزل سے گر کر وہ اسے اپنا لے، وہ یہ کبھی نہ چاہے گا۔ اس نے روحی سے پیار کیا ہے وہ بدلے میں صرف پیار چاہتا ہے۔ اس پیار کے لئے اس کے دل میں رحم کے جذبے پیدا ہوں، یہ اسے کبھی قبول نہ ہو گا۔ اور ـــــ ـــــ اگلے دن وہ شہر چھوڑ کر روحی کی زندگی سے دور چلا گیا۔

پانچ برس بعد وہ پھر اس شہر میں واپس آیا۔ اس وقت تک روحی ایک بہت بڑے گھرانے کی بہو بن چکی تھی۔ وقت ارشد کے سینے پر زخم لگاتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے روحی کے سنہرے خوابوں کی تعبیر ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور جب زندگی کو پیارا مقصد مل جاتا ہے تو انسان کے اندر کے سارے دکھ آپ ہی آپ ختم ہو جاتے ہیں، لیکن آج روحی اس سے مل گئی۔ اس کا دکھ اس کی تڑپ دیکھ کر وہ نڈھال سا ہو گیا۔ زندگی کی سختیوں کا پامردی سے مقابلہ کرنے والے اور وقت کے لگائے ہوئے زخموں کے سامنے سینہ سپر ہو کر جینے والا ارشد، روحی کی پلکوں پر

آنسو لرزتے دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ وہ سوچنے لگا ــــــــ کیا فائدہ ایسی زندگی • زندگی کے مقصد کا، جس کا کوئی حاصل نہیں۔ بہت مشکل سے روحی نے کہا۔

"اس خوش نصیب ہستی سے مجھے نہ ملاؤ گے جو اب اس گھر کی رونق ہے؟" ارشد کا چہرہ زرد ہو گیا۔ "تم جو سوچ رہی ہو ویسی کوئی بات میری زندگی کے ساتھ نہیں ہوئی ـــــ ارشد تو ہمیشہ سے روحی میں کھویا رہا۔ اس کے سنہرے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے مجھے اس عظیم عورت کا حیات بخش ساتھ ملا جس کا نام روحی تھا اور اسی کی بدولت آج میں ارشد آئی اے ایس کے نام سے جانا جاتا ہوں۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

"تمہارے بغیر جینا بہت مشکل تھا روحی! لیکن وہ سنہرے سپنے جو تم نے کبھی دیکھے تھے وہی میری زندگی کا مقصد بن گئے۔ ان خوابوں کی تعبیر تم نے آج دیکھ لی ہے نا۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ میرا وجود تو اسی دن مٹ گیا تھا جس دن میں تم سے جدا ہو کر تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"تم نے یہ کیا کیا ارشد؟ میری اک ذرا سی بات پر تم نے ـــــ تم نے مجھے اتنی بڑی سزا کیوں دی۔ اپنے آپ کو اتنا دکھ کیوں دیا؟ تم نہیں جانتے جب محبت کا آفتاب دل میں طلوع ہوتا ہے تو کئی جنموں کے گناہ آلود اندھیرے ختم ہو جاتے ہیں۔ تم نے یہ کیا کیا ارشد!!"

••

لمحے کا توازن

لمحے کا توازن بکھر گیا۔

وہ بیٹھا بیٹھا چونک اٹھا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تھی۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ اسٹیشن کی بتیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ شاید کسی چھوٹے سے اسٹیشن کا نیچا پلیٹ فارم دوسری طرف تھا۔ کمپارٹمنٹ میں کچھ لوگ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ کچھ پسینے سے تربتر ہوتے ہوئے بھی مچھروں اور پتنگوں سے بچنے کے لئے چادریں اوڑھے سو رہے تھے۔ اوپر کمپارٹمنٹ کی چھت پر صرف دو بلب جل رہے تھے۔

پسینے کی گندی بو سے اس کا جی متلا رہا تھا لیکن وہ بیٹھا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کھڑکی سے انجانے اسٹیشن کے پچھواڑے کود جائے۔ دور تک کھیتوں میں بھاگتا ہی چلا جائے۔ اتنی دور کہ کوئی اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

گاڑی پھر چل پڑی تھی۔

دھیرے، دھیرے، آہستہ...... اس کا جی پھر چاہا کہ وہ زنجیر کھینچ کر گاڑی اور وقت دونوں کی پرواز کو روک لے اور پھر زور سے چیخے۔ لوگوں کو بتا دے کہ وہ خاموش، خوبصورت اور نرم چیزوں کا

متمنّی ہے۔ اسے خاموشی اور سکون چاہیئے۔ وہ ریشمی ہاتھوں سے بنے ہوئے چاندی کے تاروں سے جھولوں کے ہاروں کا خواہاں ہے۔ اسے ریل کے خشک سفر سے نفرت ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ گاڑی چلتی ہوئی کسی ایسی اندھیری سرنگ میں کھو جائے جہاں سے پھر نہ نکل سکے —————— اسے حسن، لطافت، پاکیزگی اور نرمی چاہیئے۔ زندگی کتنی غیر متوازن، کتنی پاکیزہ، کتنی خشک اور کتنی غیر شاعرانہ ہے۔

ٹیلی گرام میں صرف یہی لکھا تھا "Come Soon, Rajni Serious"

اس نے جیب سے ٹیلی گرام نکال لیا۔ اس کے لئے تو جیسے خدا ہی مر گیا تھا۔ ٹیلی گرام اس نے ایک بار پھر پڑھا۔ الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے تو اس نے کاغذ تہہ کر کے پھر جیب میں رکھ لیا۔ ایک طویل سانس لی۔ قمیص کے بٹن کھول دیئے اور پاؤں سامنے کی سیٹ پر پھیلا دیا۔

ایک لمحے کیلئے اس نے آنکھیں بند کیں پھر اس کے ہونٹوں پر ایک بھدی سی گالی آئی۔ گالی ہواہیں اچھلنے سے بال بال بچی۔ ایک پتنگا اس کے کھلے گریبان میں گھس گیا تھا اور اب سینے کے بالوں میں الجھ رہا تھا۔ اسے بہت بے رحمی سے مسل دیا۔ اس کا جی پھر متلا گیا۔

"مجھے رجنی سے اس کی بیماریوں سے نفرت ہے۔" اس نے خود سے کہا

"نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو، بکواس ہے یہ سب! تم تو اس کے لئے ایک ایک لمحہ گن گن کر کاٹتے رہے ہو۔" اس کے ضمیر نے ایک ٹھوکا دیا۔

"لیکن کچھ بھی ہو۔ اس کی وجہ سے میں لاکھوں مصیبتوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میرے دکھوں کا کارن صرف وہی ہے۔"

گاڑی کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔

رجنی جب بچے کو لوری سناتی تھی تو اسے اکثر گاڑی چلنے کا خیال آیا کرتا تھا۔ آج گاڑی چلنے کی لَے سے اسے لوری کا خیال آ رہا تھا۔

لمحے کا توازن برقرار ہونے والا تھا ــــــــ اس نے آنکھیں پھر بند کرلیں۔ نیند کی وادیوں میں پہنچنے سے پہلے اس نے ایک بار پیشانی کا پسینہ جھٹکا۔ یکبارگی وہ سیٹ سے گرتے گرتے بچا۔ ایک صاحب گذر کر TOILET تک جانا چاہتے تھے اور اس غرض سے اس کی ٹانگوں کو دھکیل رہے تھے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ گذرنے والے صاحب کچھ بڑبڑاتے ہوئے گذر گئے تو جیسے اس نے ایک بار باغیانہ جذبے کے تحت پاؤں سامنے والی سیٹ پر دور تک پھیلا دیئے۔

جراب پوش پاؤں سے کسی چیز کا لمس ہوا۔ اوہ گاڈ! سامنے والی سیٹ پر کوئی لڑکی سوئی پڑی تھی۔ اور پہلے اس پر اس کی نگاہ ہی نہیں گئی تھی۔ اس کا پاؤں اس لڑکی کے گداز بازو سے ٹکرا رہا تھا۔ گاڑی کے ہچکولوں سے کبھی بازو زیادہ دب جاتا، کبھی کم۔ اس کے پاؤں سے صرف دو تین انچ کی دوری پر لڑکی کا صحت مند سینہ تھا۔ سانسوں کے آنے جانے سے اس کے گداز سینے میں زیر و بم ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لاکھویں ہی حصے میں وہ خدا بن گیا۔ اس کے زرخیز تصور نے لڑکی کو رجنی کا جسم عطا کر دیا۔ وہ کچھ دیر تک نظروں ہی میں اس کے جسم سے کھیلتا رہا۔ لڑکی کا منھ چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کی دو تین لٹیں بکھر کر سیٹ پر کنڈلی مارے بیٹھی تھیں۔ بھرپور جوانی کھیتوں کی، بھرپور، بھرپور، صحت مند دوشیزہ! کنواری دھرتی اور اس پر لہلہاتے ہوئے کھیت اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے۔ جیسے کمپارٹمنٹ رنگینیوں سے لبریز ہو گیا ہو۔

جیسے اس بند گرم اور بوجھل فضا میں سرسوں کے زرد پھول لہرا اٹھے۔ جیسے مائیکل اینجلو نے اپنا شاہکار مکمل کر لیا۔ جیسے کیٹس نے بلبل اور شیلی نے اسکائی لارک کا ترنم ریز گیت سُن لیا ہو۔

"رجنی کتنی اچھی ہے۔ چار ماہ سے میکہ میں رہ رہی ہے تاکہ وہ ڈاکٹریٹ کے لئے تھیسس اطمینان سے لکھ سکے۔ کبھی شکایت نہیں کرتی۔ کبھی گلہ نہیں آیا اس کے لبوں پر!"

"پھر تم جھوٹ کہتے ہو۔ یہ صرف دل بہلاوے کی بات ہے۔ تم نے کبھی اس سے پیار نہیں کیا!" اس کے ضمیر نے جھنجھوڑا۔

"کچھ بھی ہو، رجنی بہت اچھی بیوی ہے ——— زندگی آخر مل کر ہی کاٹنی ہے اور پھر شوہر اور بیوی کا تو زندگی اور موت کا ساتھ ہے!"

گاڑی نے وسل دیا۔ ایک پٹری بدلی۔ ایک پُل پر سے گذری ——— ——— اس کا پاؤں لڑکی کے بازو سے ہٹ کر سینہ سے چھو گیا۔ اس کے ذہن پر نرم اور گرم دھند چھا گئی۔

ایک پتنگا اس کے کھلے گریباں میں آ گیا۔ اس نے نرمی اور آہستگی سے اسے پکڑ کر ہوا میں اچھال دیا۔ اس کا جی چاہا گاڑی راکٹ کی سی تیزی سے اسے رجنی کے پاس پہنچا دے۔

لمحے کا توازن برقرار ہو چکا تھا۔

● ●

آخری فیصلہ

ان دنوں کلپنا نریندر کے ساتھ دہرہ دون گئی تھی۔ ماں بھی آگئیں ہسپتال میں اس نے ایک ننھی سی گڑیا کو جنم دیا۔ اس دن ساری رات وہ بہت روئی۔ پرکاش اسے بار بار یاد آتا رہا۔ ان دنوں نریندر نے لمبی چھٹی لے کر کلپنا کی کافی دیکھ بھال کی۔ اس کے پاس رہ کر اس کی صحت کا اتنا دھیان رکھا کہ کلپنا اس کے بے پناہ پیار کے بوجھ سے دبتی چلی گئی۔

وقت کی رفتار کے ساتھ ماں کے دن پورے ہوگئے تو کلپنا ہمیشہ کے لئے نریندر کے پاس آگئی۔ گڑیا اب پنی بن گئی تھی۔ ایک سال ——— دو سال ...... اور اب تین سال ہونے کو آئے۔ پنی نریندر کو یوں چاہنے لگی جیسے اس کی رگوں میں اسی کا خون ہو۔ ایک رات کلپنا کے دل کی بات زبان پر آگئی ——— وہ پلنگ پر لیٹی دھڑکتے دل سے اپنے فیصلے پر غور کر رہی تھی کہ اچانک اس نے دیکھا، نریندر کے کمرے میں بتی جلی اور وہ پنی کو گود میں لئے کچن میں گیا۔ دودھ گرم کر کے پنی کو پلایا۔ اسے دودھ پلانے کے بعد جیسے ہی اپنے کمرے میں پہنچا تو چونک پڑا۔ کلپنا اس کے بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"کلپنا! مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟" وہ اور قریب آگیا۔ کلپنا سر اوپر کر کے اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھیں اب چھلک پڑیں گی۔ اس کے ہونٹ ہلکے ہلکے کپکپا رہے تھے، وہ سسکنے لگی اور اچانک اس نے نریندر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"نریندر! مجھے اپنا لو۔ مجھے اپنا لو نریندر! ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خاموشی......

مکمل سکوت......

اور اچانک نریندر نے کلپنا کو کبھی نہ چھوڑنے والے انداز میں اپنی گرفت میں لے لیا۔

"آج کی رات کتنی حسین ہے۔ کاش! اس رات کی کبھی صبح نہ ہو۔" نریندر نے کہا:

"کیوں ——؟"

"آج ہمارا ہنی مون ہے نا!" نریندر نے کلپنا کی پیاسی آنکھوں میں ڈوب جانا چاہا۔

"ابھی نہیں......" کلپنا نے سنجیدگی سے کہا "پورنماشی کی رات میں، جب پپّی کی تیسری سالگرہ ہوگی۔ شبھ گھڑی ہی میں ہونا چاہئے۔" اتنا کہہ کر وہ شرما گئی۔

وہ اب نریندر کی بیوی ہے۔ ایک شوہر کی بیوی! اب وہ پرکاش کو بھولے سے بھی یاد نہ کرے گی۔ لیکن یہ کیا؟ یہ ذہن کے دریچے سے چپکے سے کون جھانک رہا ہے؟ شاید پرکاش ہے۔ پرکاش —— اچھا ذرا اسے بھی دیکھ لیں۔

ایسی ہی ایک حسین شام تھی ۔ پرکاش اور کلپنا ٹہلتے ٹہلتے اس پہاڑی کی طرف بڑھ آئے تھے ۔ گھر لوٹتے وقت اچانک بہت زور کی بارش ہونے لگی تھی ۔ قریب ہی قبائیلوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی ۔ گھر لوٹنے کا راستہ خطرناک ہوگیا تو انھیں ساری رات ایک ہی کمرے میں گذارنی پڑی ۔ ایک قبائلی نے ایک کمبل کے ساتھ انھیں اپنے ایک چھوٹے کمرے میں جگہ دے دی تھی اس ساری رات کلپنا ، پرکاش کے دل کی دھڑکن بنی اس کے سینے سے لگی رہی ۔ پرکاش ایک انجانی چاہ کی طرف کھنچتا چلا گیا ۔ اس رات کلپنا ایک حقیقت بن گئی تھی ۔ پرکاش کے دل کی حقیقت ۔ کلپنا اندھیرے کا سہارا لے کر ہمیشہ حقیقت بن جایا کرتی ہے ۔ تاریکی میں گناہ کے ہاتھ لمبے ہوجاتے ہیں ۔

اور پرکاش ذہن کے دریچوں کو بند کر کے چلا گیا ۔

جنگل میں منگل ۔ بنگلا برقی قمقموں سے جگمگا رہا ہے ۔ رنگ برنگے بلب سے سجائے ہوئے پودے بقعۂ نور بنے ہوئے ہیں ۔ حسین تتلیوں جیسے شریر بچے خوبصورت لباس میں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں ۔ پپّی کی سالگرہ کے علاوہ ایک خاص کام انجام پانے والا ہے ، جو صرف نریندر اور کلپنا تک ہی محدود ہے ۔ اپنے دوستوں کو نریندر نے شہر سے پارٹی میں شریک ہونے کے لئے بلایا ہے ۔ رات کے گیارہ بجے پارٹی ختم ہوگئی ہے ۔ اپنے مہمانوں کو ان کے کمرے تک چھوڑنے کے لئے نریندر ان کے ساتھ چلا گیا ہے ۔ پپّی سوگئی ہے ۔ کلپنا نے اس پلنگ کا جائزہ لیا ، جسے نریندر نے نئی نویلی دلہن کی طرح سجا رکھا ہے ـــــــــ پھولوں کی لڑیاں ، کلیوں کی جھرمٹ ـــــــ

پورا کمرہ معطر ہو رہا ہے۔ ان تمناؤں اور ارمانوں کا حسین ترین انعام۔
اس نے چاہا کپڑے بدل کر اس چتا پر اپنے آپ کو زندہ لاش کی طرح ڈال دے۔ لیکن ...... سامنے ہال کے دروازے پر پرکاش اپنی معصوم اور ادھوری تمناؤں کا جنازہ اپنے کاندھے پر لئے دستک دے رہا تھا۔
ایک لمحہ کے لئے اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نریندر ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔
وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔
"کلپنا!"
"کلپنا .....!" آواز پھر آئی۔ ایک گذرا ہوا زمانہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہی آواز، جسے کبھی وہ سُن کر پرکاش کی باہنوں میں سما جاتی تھی۔ پرکاش ــــ پرکاش ــــ پرکاش ......! اس کا دل چیخ اٹھا۔
پرکاش آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اس کا خیال تھا کلپنا اسے دیکھتے کھل اٹھے گی، لپٹ جائے گی اور رو پڑے گی لیکن ......
وہ لوٹنے لگا کہ کلپنا نے اسے مجبور کر دیا رُکنے کے لئے۔
"اندر نہیں آؤ گے پرکاش؟"
پرکاش اندر چلا گیا ــــ کمرے کا جائزہ لیا۔ پھولوں کی خوشبو سے فضا معطر ہو رہی تھی۔
"شاید آج یہاں کوئی بڑا جشن تھا؟"
"پپّی کی سالگرہ کی پارٹی تھی۔"
"پپّی؟ کون پپّی؟ میری اپنی بچی؟ کہاں ہے وہ؟"
پرکاش نے چاہا کہ آگے بڑھ کر پپّی کو گلے سے لگائے تاکہ دل کے اندر وہ سلگتی آگ کچھ تو کم ہو سکے۔ لیکن اس کے قدم وہیں رک گئے۔

"تمھاری کوئی بچی نہیں۔" کلپنا نے معاملے کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے دور اندیشی سے کام لیا۔ اسے بچی کے مستقبل کی فکر تھی۔ وہ اپنی بچی کو کسی قاتل یا سزا یافتہ ملزم کی بچی کہلوانا نہیں چاہتی تھی۔ نہ جانے اس کی بچی پر اس کا کیا اثر پڑے۔ وہ کہیں اپنی ماں کو غلط نہ سمجھنے لگے۔

"تمھارا بچہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ یہ تو بچی ہے میرے شوہر نریندر کی بچی۔"

"اوہ......" پرکاش صوفے میں دھنس گیا۔ "گاندھی جینتی کے موقع پر اچھے چال چلن کی بنا پر سرکار نے میری سزا معاف کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ جب سے میں تمھیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ کیوں کہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میرا انتظار اس وقت تک کروگی جب تک میری سزا پوری نہ ہو جائے۔ تم نے بتایا تھا کہ مسوری میں نریندر کے ساتھ صرف اپنے دن گذار رہی ہو اگر تمھارے پر، تمھارے انتظار پر' اپنے بچے سے ملنے کی امید پر ذرا بھی شک ہوتا تو یقین کرو کلپنا! میں اس مبارک موقع پر کبھی نہ آتا۔"

کلپنا ان جذبات سے بھیگے جملوں سے مجروح سی ہو کر رہ گئی۔

پرکاش واپس جانے لگا۔ کلپنا نے اس کا راستہ روک لیا۔

"پرکاش.....!" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے پکڑتے رہ گئی: "اس طوفان میں کہاں جا رہے ہو؟"

پرکاش کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری' تلخ تبسم ——— اور وہ بوجھل قدموں سے باہر چلا گیا۔

● ●

صبح کا بھولا

جس ہستی کو کھو کر میں نے سب کچھ کھو دیا ، جس کی یادمیں بے شمار راتیں میں نے جاگ کر گذار دیں ، جس کی بے وفائی اور بے رُخی نے میرے دل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس طرح مُردہ کر دیا جس میں پھر کسی آرزو کی تشکیل نہ ہو سکی ۔ آج وہی ہستی خود مجھ سے ملنے کے لئے بے چین ہے ۔ منزل خود مسافر کو صدا دے رہی ہے ــــــ لیکن کب ؟ جب میلوں کے فاصلے ' احساسِ خودداری کے طویل و فصیل اور خود اپنے احساسات کے ناقابلِ عبور خلیج ہمارے درمیان حائل ہو چکی ہیں ۔ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے میں کیا اس نے دیر نہیں کی ہے ؟ اس کی بے اعتنائی ' اس کی بے التفاتی نے میرے وجود کے گرد احساسات کا وہ جال بُن دیا ہے جس سے شاید میں خود کو آزاد نہ کرا سکوں حالانکہ اس کا پیغام میرے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جیسے ایک اندھے کو آنکھیں مل گئی ہوں ۔ دل ٹُمک ٹُمک کر اس چاند کو پانے کی سعی کر رہا ہے جس کے لئے وہ آج تک بے تاب رہا ہے ۔ اُف ! میں کیا کروں ؟

اور میرے احساسات و جذبات کی شدّت مجھے ایک بار پھر ماضی

کے مسرت و انبساط اداسی اور محرومی کے سنگم پر لے گئی۔

وہ بہار کے دن تھے۔ سمیرا میرے ساتھ ساتھ تھی۔ سمیرا کو میں جب بھی دیکھتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے سمیرا شفق کے جھولے پر جھولتے ہوئے میرے قریب آگئی ہو۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ مجھے یہ احساس ہوتا میں شہزادہ سلیم ہوں اور سمیرا انارکلی! ــــ لیکن..... لیکن انارکلی تو روایت کے مطابق محبت کے جرم میں دیوار تلے چنوادی گئی تھی ــــ مگر ــــ سمیرا ــــ میں سمیرا سے پیار کرتا تھا۔ میں نے سمیرا کی کلپنا کو پوجا، عبادت کی اور چاہا۔ میں تو چاہتا تھا۔ اسے جتنا پیار دے سکوں دے دوں۔ لیکن ...... میری بدنصیبی ہمیشہ میرے آگے آگے چلتی رہی۔ خدا گواہ ہے' میں نے اس کے علاوہ زندگی میں کبھی کسی کو پیار نہ کیا۔ لیکن جب اسے پانے کی امیدیں بالکل دھندلی ہو کر اندھیروں میں جا کھوئیں تو مجھے...... عورت ذات سے نفرت ہوگئی۔ میں عورت سے نفرت کرنے لگا۔ میں پیار کی آگ میں جلتا رہا مجھے ہر ایک نے بھلا برا نام دیا۔ میرے خیالوں کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے پیار کیا تھا نا۔ ایک لڑکی کو چاہا تھا۔ اسی لئے سچا پیار سراب بن گیا' میری زندگی میں۔ میں دوڑتا رہا' وہم و گمان کے سائے کے پیچھے۔ جب میں نا امید ہو گیا تو مجھے نفرت ہوگئی' پیار سے' پیار کرنے والوں سے۔ مجھ سے کوئی ہمدردی کی باتیں کرتا تو مجھے یوں لگتا ــــ مجھ سے کسی نے بہت گندا مذاق کر دیا ہو۔ میری زندگی کا یہ درد مجھ سے رہے سہے اپنوں کو بھی چھین لے گیا۔

غم و فکر سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے اپنے آس پاس جھوٹی خوشیوں کا خول چڑھا کر جینے کی آرزو کی لیکن زندگی کا یہ کھوکھلا پن، میں زندہ

لاش کی طرح خود کو اٹھائے پھرتا رہا۔ پریشان بے چین سا۔ لیکن سمیرا کے لئے میرے دل میں سویا ہوا پیار ہمیشہ مچلتا رہا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا ــــ "راشد! تم نے مجھے اپنی قربت کا اتنا عادی بنا دیا ہے کہ اب تم مجھ سے ایک پل بھی دور ہو گئے تو........ تو میں تنہائی سے گھٹ کر مر جاؤں گی۔" پھر کہنے لگی ــــ پیار وہی سچا ہوتا ہے جس میں بغاوت کی بو آتی ہو۔ غلام ذہنوں میں جنم لے کر تو پیار ایک داغ بن جاتا ہے عمر بھر کے لئے۔" میں نے سمجھا اسے میرے پیار پر شک ہو رہا ہے۔

"کیا تمھیں مجھ پر یقین نہیں ہے سمیرا؟"

"ارے! یقین تو ہے اپنے راشد پر۔ اسی امید اور یقین پر تو میں سماج سے بغاوت کرنے کی بات سوچ رہی ہوں۔"

اس کے بعد ــــ ہم ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ وہ میری خواہشوں کی اور خوشیوں کی منزل بن گئی۔ اور میں ــــ وہ کہتی ــــ "میرے راشد! تم ہی تو میری زندگی ہو۔"

کبھی کبھی اس کی چاہت پر غرور سا ہونے لگتا تھا۔ ایک دن وہ کہنے لگی ــــ "راشد! تمھاری ایک بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔"

"کیا بات ہے سمیرا؟"

وہ اور سنجیدہ ہو گئی اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولی: "ایسا ہے راشد! تم میری ہر بات مان لیتے ہو نا۔ یہی مجھے اچھا نہیں لگتا۔" میری جان میں جان آئی اور میں زور سے ہنس دیا تھا ــــ سنو تو! تم کبھی کبھی روٹھا بھی کرو، ضد بھی کیا کرو، ناراض ہو جایا کرو ــ تم روٹھو گے تو میں تمھیں مناؤں گی۔ کتنا اچھا لگے گا۔"

"اچھا ڈیئر! اب روٹھ جایا کروں گا!"

حالات نے ایک دم کروٹ بدلی۔ ہمارا پیار گلی گلی بدنام ہو گیا۔ ہمارے پیار کو زمانے کی نظر لگ گئی ــــــــ میری سمیرا بھی تو ایک لڑکی تھی۔ ان بے شمار لڑکیوں جیسی جو پیار کی دنیا میں قدم رکھتی ہیں تو یہ سوچ کر کہ وہ جس سے پیار کریںگی اسی کے لئے زندہ رہیں گی، مر جائیں گی اسی کے لئے۔ بڑی بڑی قسمیں کھاتی ہیں، لمبے چوڑے وعدے کرتی ہیں۔ لیکن حالات کی ایک ہلکی سی گردش سے وہ اس قدر بدل جاتی ہیں کہ کوئی انھیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ وہ مجھ سے بچی بچی سی رہنے لگی۔ کبھی مل جاتی تو نظریں بچا کر نکل جاتی۔ سامنا ہو جاتا تو منہ پھیر لیتی۔ میں بھی نہ چاہتے ہوئے اچانک بدل گیا۔ مجھ سے میری سمیرا چھن گئی۔ لیکن اس کی دی ہوئی پیار کی آنکھیں میرے من میں ہر وقت کسکتی رہیں۔ اس کا پیار میرے لئے بھی نہ بجھنے والی پیاس بن گیا۔

آج اچانک وہ مجھے مل گئی ہے۔

آنکھوں میں سرور و انبساط کی شراب سی چھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے بند ٹوٹ چکے تھے ــــــــ "راشد! مجھے معاف کر دو! میں نے تمھیں بہت دکھ دیا ہے۔ میں آج بھی تمھیں اتنا ہی پیار کرتی ہوں جتنا کبھی کرتی تھی!"

"سمیرا! اب آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہم دریا کے کنارے کھڑے وہ درخت ہیں جو پانی کے پاس رہ کر بھی پیاسے ہیں۔"

آنسو!

خاموشی!

سکوت!

"لیکن ہم نے تو وقت کا انتظار کیا ہے راشد!"

معاً اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت اور بھی مضبوط ہوگئی۔ ایک لمحہ گذر گیا۔ وہ بے تحاشہ میرے سینے سے لگ گئی۔ اس کی گرم سانسوں سے میرا رواں رواں کانپ گیا۔

یہ بات تو میں کسی سے نہیں چھپا سکتا کہ مجھے سمیرا سے پیار ہے۔ وہ پیار نہیں جو کالج کے دروازے پر جنم لیتا ہے، کسی پارک کی سنسان بنچ پر جوان ہوتا ہے اور گھر کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی دم توڑ دیتا ہے!!

●●

کھویا ہوا چہرہ

برگد کے بوڑھے پیڑ کی سوکھی ڈال پر بیٹھا ہوا اُلّو ایک بار پھر چیخ اٹھا ہے۔ اس کی چیخ رات کے سنّاٹے میں گونج کر رہ گئی ہے۔ وہ بھاگا جا رہا ہے۔ کہاں؟ اسے خود نہیں معلوم۔ شاید اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ چرچ کے گھنٹے نے چیخ کر رات کا تیسرا پہر گذر جانے کا اعلان کر دیا ہے۔ ایک گھر کے سامنے اچانک اس کے قدم رک گئے۔ وہ اندر گیا۔ ایڈیٹر لکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے لکھتا رہا۔ لکھتے ہوئے ہی کہا "بیٹھو"۔ وہ بیٹھا نہیں۔ کھڑا ہی رہا۔ اس نے پھر کہا "بیٹھو۔" راجیش پھر بھی نہ بیٹھا۔ کھانس کر گلا صاف کیا اور بولا "بیٹھوں گا نہیں، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ اسی طرح لکھتا رہا اور بولا "کہانی لائے ہو؟"

"نہیں! کہانی نہیں لایا ہوں۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے بہت بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

اس کی باتوں کو سن کر ایڈیٹر نے کہا "دیش کے سامنے بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔ کون جانے کیا ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا!"

"آپ تو ایڈیٹر ہیں۔ آپ کے پاس سبھی پریشانیوں کا حل ہے۔ اداریہ کا کالم ہے۔ میں اپنے پرابلم کے لئے آپ کے پاس آیا تھا۔" ایڈیٹر ہنسا، ہنستا ہی رہا۔ اس کا قلم نہ رکا۔ لکھتے ہوئے ہی کہا:

"تمہارا پرابلم کیا ہے؟ نوکری؟ 'منتری جی کے لئے خط؟' ایم۔ایل۔اے کی سفارش؟"

راجیش پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ اس کی قمیص اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ وہ بولا "نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن پھر بھی ضروری ہے۔ ضروری بھی ہے اور خطرناک بھی۔ پلیز ہیلپ می!"

اسی انداز میں ایڈیٹر نے بیٹھے ہوئے کہا۔ "اپنی بات کہو۔"

راجیش نے کہا "آپ میری طرف تو دیکھئے۔ میرا پرابلم کچھ عجیب ہے براہ مہربانی میری طرف دیکھئے تو سہی۔" ایڈیٹر نے سر نہیں اٹھایا۔ بولا:
"لکھنا کیسے بند کردوں؟ تم بولو میں سن رہا ہوں۔ سبھی پریشانیوں کا حل اس قلم سے نکلے گا۔ تم بولتے جاؤ۔ تمھیں کیا چاہیے۔ سیاست میں آؤ گے؟ تمھیں نوجوان تنظیموں کی خبر دے سکتا ہوں۔ خفیہ باتیں بتا سکتا ہوں۔ کس سے دوستی کر کے بلندی پر پہنچ سکتے ہو۔ بیٹھو اور بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرو۔"

راجیش نہیں بیٹھا۔ کھڑا رہا۔ بولا، "بہت بڑی آفت ہے مجھ پر! آج صبح سے میرا چہرہ نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔ آئینے میں دیکھنے گیا تو بالکل صاف۔ کچھ بھی نظر نہ آیا۔ کوئی احساس نہیں۔ سکھ دکھ کی پرچھائیں تک نہیں ہے میرے چہرے پر۔ بہت سوچا لیکن دماغ نے کام کرنے سے

انکار کر دیا۔ کیسا تھا میرا چہرہ؟ کیسا تھا، کیا تھا؟ سوچ نہیں پا رہا ہوں۔ کیا کروں، پلیز ہیلپ می!"

ایڈیٹر لکھتا ہی رہا۔ لکھنا بند نہیں کیا۔ عینک ٹھیک نہیں کی۔ سر اوپر نہیں اٹھایا اور کہا "تم صرف اپنے لئے اتنے پریشان کیوں ہو؟ دیش کا چہرہ کھو گیا ہے، ہمیں تلاش کرنا ہوگا۔ دیش کو اس کا چہرہ واپس دلانا ہوگا۔"

آدرشوادی ایڈیٹر کی آدرش وادی باتوں سے بور ہوتے ہوئے راجیش نے کہا "آپ میری بات کو بہت ہی سفاکی سے نظر انداز کر رہے ہیں۔ میں اپنے چہرے کی بات کر رہا ہوں اور آپ دیش کی بات کر رہے ہیں۔"

"تم کیا دیش کے باہر ہو؟ دیش کا چہرہ نہیں ہے تو تمہارا چہرہ کہاں سے آئے گا۔ دیش کا سارا انتظام ہی تتر بتر ہو کر رہ گیا ہے۔ دیش کی فکر کرو۔"

راجیش کو یہ سنکر غصہ آگیا "دیش کا چہرہ کھو گیا ہے، میرا چہرہ کھو گیا ہے، آپ کا چہرہ کیوں نہیں کھویا؟ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر سکون کی سانس لے رہے ہیں؟"

راجیش ابھی تک یوں ہی کھڑا تھا۔ ایڈیٹر کرسی پر اپنی پیٹھ سیدھی کرتے ہوئے بولا "راجیش! میرا بھی چہرہ نہیں ہے۔ صرف نقاب ہے اس نقاب کو چہرہ مان لیا۔ بہت بڑی بھول ہے تمہاری۔ میرے مالک جو کہتے ہیں وہی لکھتا ہوں۔ جو بولتے ہیں وہی کہتا ہوں۔ جو کھانے کے لئے دیتے ہیں وہی کھاتا ہوں۔ میں اچھا اور ایمان دار نوکر ہوں۔ میرا بھی چہرہ

نہیں ہے رآجیش! دیش کا چہرہ نہیں ہے، کسی کا چہرہ نہیں ہے!" تھوڑی دیر تک ایڈیٹر لمبی سانس لیتا رہا پھر بولا، "تمھیں شاید معلوم نہیں رآجیش! سبھی پریشانیوں کا حل میرے پاس ایک اداریہ ہے اور کچھ بھی نہیں، میں بہت بے بس ہوں۔ سامنے بہت بڑا خطرہ ہے۔ تم بعد میں آنا پھر کبھی۔ لیکن آج نہیں۔ مجھے باہر جانا ہے رآجیش! ۷۰ کروڑ کی آبادی، اتنا بڑا دیش۔ دیش کا چہرہ نہیں، تمھارا چہرہ نہیں، میرا چہرہ نہیں، کسی کا چہرہ نہیں۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں پھر سوچوں گا۔ سوچ سوچ کر اداریہ لکھوں گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں۔ رآجیش! تم پھر کبھی آنا۔ اچھے وقت پر!"

ادیب نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لیتے ہوئے بولا، "ارے! میں نے تو اب تک نہیں دیکھا تھا، کہاں گیا تمھارا چہرہ؟"

رآجیش کچھ نہ بولا۔ ادیب سگریٹ پھونکتا رہا، پھر کہا "دیکھو نا! اتنے دن سے تمھیں دیکھ رہا ہوں لیکن اب تک غور نہیں کیا۔ حیرت ہے۔" وہ ہنسا اور ہنستے ہوئے بے دم ہو گیا۔ سگریٹ کا کش لیتا رہا اور کہا "میرے پاس کیا نہیں ہے؟ ملک کا مایۂ ناز ادیب اور افسانہ نگار ہوں، مشہور ادیب! میرے افسانوں کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں، بیس ناول لکھ چکا ہوں، پانچ تنقیدی کتابیں مرتب کر چکا ہوں۔ دو کتابیں کالج کے نصاب میں شامل ہیں۔ عزت، دولت، شہرت، سب کچھ ہے۔ اپنا بنگلہ، موٹر کار، عیش کرنے کے لئے بینک بیلنس سب کچھ تو ہے۔ میں ایک مشہور افسانہ نگار ہوں۔ ملک کا مایۂ ناز ادیب!"

راجیش نے کہا "اسی لئے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ کبھی آپ مارکس کی باتیں کرتے تھے، کچھ عرصہ سے ایلیٹ سے متاثر ہو گئے ہیں۔ آپ کے پاس ساری پریشانیوں کا حل ہے۔ میرا چہرہ کھو گیا ہے!"

ادیب سنجیدہ ہو گیا۔ بجھے ہوئے سگریٹ کو پھینک دیا۔ پوچھا، "مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آپ ادیب ہیں، افسانہ نگار ہیں۔ بہت ہی دور بیں نگاہیں آپ استعمال کرتے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی آپ کی نظروں سے بچ نہیں سکتیں۔ آپ کو یہ بتانا ہو گا کہ کیسا تھا میرا چہرہ!"

ادیب کچھ دیر تک خاموش رہا۔ سوچتا رہا۔ پھر کہا، "میں تمھیں بہت دن سے جانتا ہوں۔ تم گذشتہ دو سال سے افسانے لکھ رہے ہو۔ کئی سیمناروں اور ادبی نشستوں میں تمھیں دیکھا ہے۔ پہلے تو اسٹیج پر پیچھے بیٹھتے تھے۔ ڈائس پر آتے تو چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا تھا۔ حوصلہ بڑھا، ہمت آئی تو تم آگے آئے۔ تمھیں پہچانتا ہوں۔ لیکن تمھارا چہرہ کیسا تھا، یہ کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ احساس کی کمی ہے مجھ میں۔ مجھے اردو اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔ گیان پیٹھ کی کوشش میں ہوں۔ لیکن میں نے اپنا چہرہ بھی کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ قدرت کی کیسی ستم ظریفی ہے۔ اپنا چہرہ دیکھنے کے لئے اوپر والے نے کوئی الگ سے آنکھ کیوں نہیں دی۔ کیا آئیڈیا ہے۔ اس تھیم پر افسانہ لکھوں گا۔ عنوان ہو گا — "اپنے چہرے کے لئے دوسری آنکھ۔" راجیش! تم جاؤ۔ ایک افسانہ لکھوں گا۔ اپنی بیٹی کو بلاؤں گا۔ وہ کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کے لئے کوئی افسر لڑکا ڈھونڈ

رہا ہوں ۔ تم جاؤ ۔ وہ کاغذ اور قلم لائے گی ۔ پائپ اور تمباکو کا پیکٹ لائے گی ۔ میں لکھتے وقت پائپ پیتا ہوں ۔ لکھتے وقت ہر ادیب اور افسانہ نگار ایرسٹو کریٹ معلوم ہوتا ہے ۔ میں اپنی لڑکی کی شادی کسی ادیب یا افسانہ نگار سے ہرگز نہ کروں گا ۔ افسانہ نگار یا ادیب انسان نہیں ہوتا ۔ سماج ہمیشہ اسے نظر انداز کرتا ہے ۔ تم جاؤ ۔ میں ایک افسانہ لکھوں گا ۔"

تھکے ہوئے قدموں سے راجیش باہر آ گیا ۔ باہر آ کر ایک بھدی سی گالی ہوا میں اچھال دی اور تھوک دیا ۔

"کیا کہا ؟ تمہارا چہرہ کہاں کھو گیا ؟" ارچنا نے فون پر کہا ۔

"کیسے بتاؤں فون پر ؟" راجیش نے کہا ، "صبح سے دیکھ رہا ہوں میرا چہرہ نہیں ہے ۔ آئینے میں دیکھا نہیں ملا ۔ جس سے پوچھتا ہوں کوئی معقول جواب نہیں ملتا ۔ یاد نہیں آ رہا ہے ۔ کیسا تھا میرا چہرہ ؟"

اب کی بار کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز آئی ۔ "لے ! مدھو کے ساتھ جھگڑا کر لیا ہے کیا ؟ اچھا رکو ۔ آج ہی مدھو سے بات کرتی ہوں ۔"

راجیش اس بار غصہ سے بولا ، " ارچنا ! تم مذاق کر رہی ہو ۔ میری مجبوری کا مذاق اڑا رہی ہو ۔ میں اس وقت بہت سنجیدہ ہوں !" وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا ۔

"اچھا ، تم یہ تو بتاؤ ، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تمہارا چہرہ کھو گیا ہے ؟" ارچنا نے فون پر اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا ۔

"یہی تو مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ کیسا تھا میرا چہرہ ؟ ارچنا پلیز ہیلپ می !"

"یہ بتاؤ، مدھو سے جھگڑا کس بات پر ہوا ہے؟ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"ارچنا! اس وقت میں بہت سنجیدہ ہوں! بھیڑ میں تمہیں کہیں مل جاؤں تو تم مجھے کیسے پہچانوگی؟ سوال یہ ہے!"

"معاملہ تو واقعی بہت سنجیدہ ہے۔ خیر ایسا کرو۔ پہلے تم بھیڑ میں کھو جاؤ، پھر دیکھیں گے تم کیسے ملتے ہو۔ اور ہاں! مدھو کو بھی اس بات کی خبر کر دی ہے نا کہ تمہارا چہرہ کہیں کھو گیا ہے؟" ارچنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

راجیش نے فون میز پر زور سے پٹک دیا اور باہر نکل آیا۔

"کس چیز کی عکاسی کر رہے ہو رمیش؟" راجیش نے پوچھا

"یار راجیش! پکاسو نے لڑتے ہوئے دو مرغ کی پورٹریٹ بنائی تھی اور اسے نوبل انعام ملا۔ میں ڈال پر بیٹھی ہوئی کوئل کی تصویر بنا رہا تھا۔ دیکھو نا۔ دماغ ڈسٹرب ہوا اور یہ کوئل سے اُلّو بن گیا۔ ایک بوڑھا اُلّو۔ خیر۔ اب اسی کو پورا کر دوں گا۔ ایک بوڑھا اُلّو ـــــ یہ تو بتاؤ تمہارا آنا کیسے ہوا؟"

"یار رمیش! میرے سامنے ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ذرا کینوس پر سے اپنی نگاہ تو اوپر کرو۔"

"میں سب سُن رہا ہوں۔ تم کہتے جاؤ۔ نگاہ ہٹاؤں گا تو یہ اُلّو بھی کہیں کچھ اور نہ بن جائے۔ تم بولتے رہو۔ میں سب سُن رہا ہوں۔"

"میرا چہرہ کھو گیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیسا تھا میرا چہرہ؟ تم میری کچھ مدد کرو۔"

اس نے کینوس پر سے اپنی نگاہ اٹھائی، "تم سے اتنے عرصہ سے دوستی

ہے لیکن اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ کیسا تھا تمہارا چہرہ ؟ اچھا یہ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا ؟"

"تم تو ایک آرٹسٹ ہو۔ تمھیں یہ بتانا ہوگا کہ کیسا تھا میرا چہرہ ؟"

"اچھا راجیش ! مجھے کچھ وقت دو۔ اس وقت تو میں پکاسو کے برابر کی تخلیق کر رہا ہوں۔

تم پھر کسی فرصت کے وقت آنا۔ دیکھو ڈال پر بیٹھا ہوا اُلّو ! ماڈرن پکاسو کی ماڈرن تخلیق !"

وہ پیر پٹکتے ہوئے باہر آگیا اور بھاگا جا رہا ہے۔ برگد کے بوڑھے پیڑ کی سوکھی ڈال پر بیٹھا ہوا اُلّو ایک بار پھر چیخ پڑا ہے اور اس کی چیخ رات کے سناٹے میں گونج کر رہ گئی ہے !!

● ●

... یہی ٹھیک ہے

"اشوک! تم تو بس اس وقت ہمارے گھر آتے ہو جب ممی بھی گھر میں ہوتی ہیں۔ سچ بتاؤ، کیا میں تمھیں اچھی نہیں لگتی؟"

"سروج ——— اچھی تو مجھے تم بھی لگتی ہو اور تمھاری ممی بھی۔"

"تمھارا دل نہیں چاہتا کہ مجھے چھوؤ، مجھے پیار کرو، مجھے گلے سے لگالو۔"

"لیکن ...... تم مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی ہو......"

"اور ممی تو تم سے عمر میں کافی بڑی ہیں۔ تم ان میں کیوں زیادہ دلچسپی لیتے ہو، کیوں رات کو دیر تک ان سے باتیں کرتے رہتے ہو؟ کیا تمھیں یقین آئیگا کہ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو دل دیا ہے؟"

"ایک نہ ایک روز یہ دل دینا ہی تھا کسی کو تو!"

اسی شام جب میں مسز تیاگی کے ساتھ ان کی کار میں گھر واپس آرہا تھا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا میں تمھیں اچھی نہیں لگتی اشوک؟"

"جی! آپ مجھے واقعی اچھی لگتی ہیں اور سروج بھی......"

"لیکن ...... کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ تم صرف مجھے پیار کرو...."

"مگر ...... مگر...... آپ مجھ سے عمر میں کافی بڑی ہیں۔"

"اور سروج تو تم سے عمر میں بہت چھوٹی ہے۔ تم اس میں کیوں اتنی دلچسپی لیتے ہو۔ کیوں اسے پڑھانے آتے ہو، کیوں میری نظریں بچا بچا کر اسے دیکھا کرتے ہو؟"

ایک شام جب میں ان کے گھر پہنچا تو صرف مسز تیاگی موجود تھیں۔

"سروج کہاں ہے؟"

"وہ پکچر دیکھنے گئی ہوئی ہے۔"

مسز تیاگی نے مجھے اپنے قریب صوفے پر بٹھالیا، "آج ہم بالکل اکیلے ہیں۔ یہ شام تم ہمیشہ یاد رکھو گے۔" مسز تیاگی کی آغوش گرم گرم ہوتی جا رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور سروج کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر مسز تیاگی کی طرف دیکھا لیکن وہ مسکرا رہی تھیں۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ۔ سروج چند لمحوں تک ہم دونوں کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ پھر کچھ کہے بغیر ہی ہمارے کمرے کا دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

"یہی ٹھیک ہے۔ کچھ روز تک وہ اداس رہے گی پھر رفتہ رفتہ نارمل ہو جائے گی!!"

••

احساس

انسان خدا تو نہیں ہو سکتا لیکن وہ خدا کی طرح مجھ سے قریب تھی۔ میں اکثر سوچتا ہوں وہ اگر پاس ہوتی تو دنیا میں کوئی غم نہیں تھا لیکن وہ میری زندگی میں اس طرح آئی جیسے رات کی خاموشی، اداس تنہائی میں پھولوں کی خوشبو جیسے سمیٹ کر اور دل میں چھپا کر رکھ لینے کا ارادہ ہو ——— ——— بھلا خوشبو بھی کبھی قید ہو سکی ہے؟

لیکن اس کا میری زندگی سے چلا جانا اس کے آنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ اس طرح چلی گئی جیسے دھوپ دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے، روشنی گم ہو جائے، اجالا کھو جائے۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ جو کبھی ایک ہنسی کی طرح میرے ہونٹوں پر چھائی تھی، آنسو بن کر میری آنکھوں، میرے دل سے نکل جائے گی۔ اب سوچتا ہوں، واقعی وہ خدا کا ہی ایک روپ تھی جو بظاہر بہت مہربان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن دراصل وہ ہوتا کچھ اور ہی ہے۔

اس پانچ سال کی طویل مدت نے ہماری زندگیوں میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ میں نے وہ شہر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنی تمام مصروفیات

تعلیم پر مرکوز کر دی تھیں۔ ظاہر ہے جب زندگی اتنی مصروف ہو جاتی ہے تو طالب علمی کے زمانے کا رومان اور احساسات خود بخود کہیں گم ہو جاتے ہیں لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ روحی شکل و صورت کے حساب سے قدر تمناسب تھی۔ ہماری ملاقات شادی کی ایک پارٹی میں ہوئی تھی میزبان کے ذریعہ پتہ چلا کہ محترمہ بھی میری یونیورسٹی میں ہی ہیں۔ اور پھر چھو لمحہ لمحاتی پہلی ملاقاتیں قربت کی شکل اختیار کر گئیں۔ روحی نے ہی اپنی نمناک آنکھوں سے مجھے وہ سنہرے خواب دکھائے تھے جس کا تصور بھی میرے لئے مشکل تھا۔ میں نے لسے اس سے روکا بھی۔ ایک بار اس نے اپنے گال میرے گالوں پر رکھ دیئے اور میرے کان کے پاس اپنے ہونٹ لے جاکر کانپتی ہوئی آواز میں کہا، "مجھے چومو"

مجھے محسوس ہوا جیسے آس پاس کا سناٹا سرگوشیاں کرتے ہوئے مجھ سے کہہ رہا ہو، یہ پیار کسی خاموش بغاوت کی نشان دہی تو نہیں کر رہا ہے۔ بغاوت، خاموش مگر زندہ! وہ میٹھی سی نسوانی گرفت میں لے کر میری چھاتی کو دلار رہی تھی۔

"روحی! کیسا لگ رہا ہے تمھیں؟"

"محسوس ہو رہا ہے جیسے کئی جنموں کی پیاسی تھی میں" وہ پاگلوں کی طرح میرے ماتھے کو، آنکھوں کو، ٹھوڑی کو، گالوں کو چوم رہی تھی۔

"راشد ــــ!" اس نے ہلکے سے کھوئی ہوئی آواز میں پکارا۔

"ہاں.."

"وہ کون سی گھڑی تھی جب تم نے مجھے پہلا خط لکھا تھا۔ اس اجنبی کو جس کے بارے میں تم کچھ بھی تو نہیں جانتے تھے۔ کیا سوچ کر یہ دوستی

کمرے میں چلی آئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو لے لیا۔ وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ مجھے اسے اس طرح بے بس دیکھ کر ایک سکون اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہی احساس جو لاٹری کے جیت جانے کے بعد ہوتا ہے میرے جذبات کے شدت پر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میرے تمام وجود پر ایک تجسس طاری رہا۔ "تو یہ وہی روحی ہے۔ جس نے لمبے چوڑے وعدے کئے تھے، اور پھر انھیں خود ہی مسمار کر دیا تھا۔" میرے ذہن میں جیسے ایک آواز سی آتی رہی "جسے حاصل کرنا ہی تمھاری زندگی کا مقصد تھا، جس نے بے رحمی اور بے وفائی کی ٹھوکر تمھیں دی تھی، اب تمھاری شکار ہے۔ تم اس تیزی سے ڈھلتی رات کا بھرپور فائدہ اٹھاؤ۔" اور میری گرفت اس پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ دوسرے لمحہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے: "روحی جسے میں چاہتا تھا جو بے وفا ہو گئی تھی، ہو سکتا ہے کسی مجبوری کے سبب وہ بے وفا ہو گئی ہو۔ اگر وہ روحی ایک شاندار محل تھی تو یہ روحی جو میری باہوں میں ہے اس محل کا کھنڈر ہے۔ گذرتے ہوئے وقت نے اس محل کی رونق سے اس کا سب کچھ لے لیا ہے اور بس ایک کھنڈر چھوڑ گیا ہے۔"

میری گرفت اس کے بازوؤں سے ڈھیلی پڑنے لگی۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں سے الگ کرنا چاہا لیکن روحی نے اپنی گرفت مجھ پر تیز کر دی۔ وہ بری طرح مجھے اپنے سے چمٹائے رہی۔ اس کی سانسیں تیز ہوتی گئیں۔ وہ کہنے لگی۔ "ارشد! میں مجبور تھی ارشد! میں بے وفا نہیں ہوں۔ زمانے کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ ایک بے سہارا اور بے بس عورت تھی۔ تم مجھے پناہ دو گے نا ارشد!" ـــــ میری خوشی کا احساس کہیں گم ہو چکا تھا۔ میں بس اسے دیکھتا رہا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

●●

وہ میرے پہلو میں کار میں بیٹھ گئی اور میں کار ڈرائیو کرتا ہوا ریسٹورنٹ پہنچا۔ کھانا کھانے کے بعد جب کیبرے کا پروگرام شروع ہوا تو وہ بہت انہماک سے دیکھتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری خوشیاں اسکے وجود میں سما گئی ہوں۔ وہ آرکسٹرا کی دُھن کے ساتھ تھرکتی رہی۔ پھر میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ہنستے ہوئے مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ میرے دل میں شدّت سے نہ دبنے والا وہ احساس ابھرنے لگا کہ میں روحی کو لئے ہوئے اپنے اکیلے اور سنسان مکان میں پہنچوں اور اس کے حسین و جوان وجود اور غرور کا سر نیچا کر دوں۔ ایک غرور اور برتری کا جذبہ میرے ذہن میں گردش کرنے لگا اور جذبات کی آسودگی کی خواہش ذہن میں کروٹیں لینے لگی۔ نہ جانے کیوں ان خیالات کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ میں اس کی شخصیت کو کچل کر اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ جسکے وجود نے میری راتوں کی نیند، صبر و قرار، چین سب حرام کر دیا تھا جس نے میرے پیار کو بہت ہی سفاکی سے نظرانداز کر دیا تھا۔ آج وہ میرے ہاتھوں میں مسحور تھی۔ کیوں نہ اس کے گذشتہ غرور کے بچے کھچے حصے کی دھجیاں اڑائی جائیں اور اس طرح اس کی بے وفائی کا انتقام لیا جائے؟ میں پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور مسکراہٹ پھیلی رہی۔

میں اسے لیکر اپنے گھر پہنچا تو رات کافی ڈھل چکی تھی۔ میں گھڑی دیکھتے ہوئے اُٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ اُٹھ گئی۔ میں اس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ کیا وہ میرے ساتھ میرے بیڈروم میں آئے گی یا اس چار کمروں کے فلیٹ میں کسی ایک کمرے میں سو جائے گی۔ لیکن وہ میرے پیچھے ہی میرے

کرنی چاہی تھی تم نے۔"

"بس! اتنا ہوا کہ تم نے مجھے اندر سے چھو لیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے تمہیں عرصے سے جانتا ہوں اور میں نے تمہیں بس خط لکھ دیا۔"

"راشد! تم کوئی جادوگر تو نہیں؟ میرے اوپر تم نے کیسا جادو کر دیا ہے کہ مجھے نہ تو دن کو چین ہے اور نہ رات کو قرار۔ بولو راشد! تم نے تو مجھے اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔ بس میرے دل و دماغ پر تم اور صرف تم چھائے رہتے ہو۔"

"نہیں روحی! میں کوئی جادوگر نہیں۔ یہ صرف تمہارا ذہنی تصور ہے۔"

"لیکن تم اس سے مختلف بھی تو نہیں۔"

ہم بدنام ہو گئے۔ روحی قید کر لی گئی۔ میں نے کئی خط لکھ کر اسے بھجوائے۔ اپنی قربت کا واسطہ دیا۔ لیکن میری منت و سماجت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے قطعی طور پر مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ مجھے میرے دوست کے خط سے یہ پتہ چلا کہ روحی کی شادی ہو گئی۔ روحی کی یہ ازدواجی زندگی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی۔ مجھے نہ جانے کیوں اسکی ازدواجی زندگی کی ناکامی کی خبر پا کر ایک عجیب سی مسرت اور خوشی کا احساس ہوا تھا۔ کسی میچ میں مدمقابل ٹیم کی شکست پر جس خوشی کا احساس ہوتا ہے بالکل ویسی ہی خوشی کا احساس مجھے ہوا تھا۔

آج وہ مجھ سے ملنے میرے شہر آ رہی ہے۔

جب اس نے مجھے دیکھا تو بہت ہی فراخ دلی سے مجھ سے ہاتھ ملایا

کائنات

کبھی کبھی خواہشیں بھی قبر بن جاتی ہیں جس پر انسانی زندگی کے آخری دنوں تک یادوں کے پھول چڑھایا کرتا ہے۔ ان دنوں میں بھی یادوں کے پھول ہی چڑھا رہا ہوں۔ میں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوں۔ میں ایک مرا مرا سا انسان ہوں جو اندھیرے میں ٹکریں مار رہا ہے اور روشنی کا پٹ ہے کہ کھلتا ہی نہیں۔

رکشہ ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ بغل والے سنسان میدان میں دو نسوانی شکلیں ابھریں۔ وہ رکشہ کی طرف بھاگی آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ ہلا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران ہوا۔ لیکن جلد ہی یہ حیرانی دور ہو گئی کیونکہ ان میں سے ایک کائنات تھی۔

"غضب ہو گیا۔" نزدیک آ کر کائنات نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں کہا پتہ نہیں کتنی دور سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ دھوپ میں بھاگ دوڑ کی وجہ سے شاید کائنات کا رنگ اور سرخ ہو گیا تھا اور چھاتیوں میں بلا کا تموج ہو رہا تھا

"ذرا سی دیر ہو گئی ہوتی تو رکشہ نکل جاتا اور بس آفت آ ہی گئی تھی!" کائنات نے اکھڑتی ہوئی سانسوں میں اپنی سہیلی سے کہا اور پھر جواب کا انتظار

کیے بغیر ہی مجھ سے مخاطب ہوئی "سنو! سب گڑبڑ ہو گیا۔ تم رکشہ چھوڑ دو اور فوراً میرے ساتھ چلو۔"

"کیوں؟ آخر بات کیا ہے؟" رکشہ چھوڑنے کے بعد میں نے کہا، "تمھیں میرا خط مل گیا تھا نا کہ میں اسی ٹرین سے......"

"نہیں تو بھاگی کیوں آرہی ہوں!" کائنات نے کہا "ہائے رے! اگر شارٹ کٹ نہ آتی تو آج تو میں مر ہی جاتی......... سنو راشد! سب گڑبڑ ہو گیا تمھیں مجھے معاف کرنا ہوگا۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ آج اتنی بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی ورنہ تمھیں لکھتی ہی کیوں؟ معلوم ہے اس وقت گھر پر کون کون ہے؟ میرے شوہر، بچے، چھوٹا بھائی اور ماں......" میں نے دیکھا اس وقت کائنات بُری طرح گھبرائی ہوئی تھی اور کانپ رہی تھی۔

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے اطمینان سے ہنس کر کہا "میں ابھی واپس لوٹ جاتا ہوں۔"

"نہیں راشد! ایسی بات نہیں۔" کائنات جیسے بیزار ہو گئی "میں کیا تمھیں واپس بھیجنے آئی ہوں؟ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اس وقت ایک دو گھنٹے کسی ریستراں یا پکچر ہال میں گذار سکو تو ٹھیک ورنہ......"

"یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔" میں نے بظاہر ناراض ہو کر کہا "ایک تو شہر میرے لئے بالکل نیا ہے اور ریستراں وغیرہ میں بھٹکنا میرے لئے......"

"ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں!" کائنات بولی "لیکن راشد! ناراض کیوں ہو رہے ہو؟ کچھ میری حالت پر بھی تو ترس کھاؤ۔"

بات مجھے لگ گئی۔ ترس بھی آیا اور اپنی خفگی پر کوفت بھی ہوئی۔ بری

بات ہے۔ میں نے خود سے کہا اور تناؤ کچھ کم ہو گیا۔

"اچھا ایک کام کریں!" ایک لمحہ کائنات نے ساتھ کی عورت کی طرف دیکھ کر کہا "تم مسز اگروال کے ساتھ چلے جاؤ اور اتنے میں مَیں گھر جاکر دیکھتی ہوں کہ............ میں نے تم لوگوں کا تعارف کرایا ہی نہیں یہ میری بہت خاص سہیلی ہیں، مدھو اگروال۔ اور مدھو یہ ہیں.........."

گندمی رنگ کا چھریرا بدن۔ صاف شفاف جلد پر خوب نمایاں لیکن بے حد خاموش آنکھیں اور بوٹا سا قد ——— مسز اگروال........ عورت سے زیادہ لڑکی معلوم ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں مسکرا کر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔

"کیوں مدھو! ٹھیک ہے نا؟ تم انھیں اپنے ساتھ لے چلو اور مَیں گھر چل کر دیکھتی ہوں کہ........"

مسز اگروال کے چہرے پر عجیب شش و پنج میں پھنس جانے کا احساس دیکھ کر میں نے کہا "ان کے ساتھ جاکر میں کیا کروں گا؟"

"یہ تو تمھیں پہنچ کر ہی معلوم ہوگا۔" کہتی ہوئی کائنات ہنس پڑی ——— ایک کھوکھلی ہنسی، جس نے مسز اگروال کو نروس کر کے کانوں تک سُرخ کر دیا۔ مجھے یہ مذاق اچھا لگا اور نہیں بھی اور اس سے پہلے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچوں، واپس جاتی ہوئی کائنات کو یہ کہتے سُنا "ڈر نا مت، مَیں تم سے دور نہیں تمھارے آس پاس ہی رہوں گی۔ اچھا......."

ایک اچھا خاصہ فاصلہ طے کرنے کے بعد مسز اگروال نے کہا "وہ آگیا، وہ اس سائن بورڈ کے پاس والا گھر......"

"آپ کا.......؟"

"نہیں! میرا گھر تو پیچھے رہ گیا۔ یاد نہیں تھوڑی دیر پہلے آپ کو باہر روک کر میں جس مکان میں گئی تھی۔"

"ہاں، لیکن آپ نے یہ کہاں بتایا تھا کہ وہ آپ کا گھر ہے؟"

"شاید بھول گئی ہوں گی۔ ہم لوگ وہیں چلنے والے تھے۔ کائنات سے طے بھی یہی ہوا تھا لیکن اس وقت مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ مسٹر اگروال کی آج شام کی ڈیوٹی ہے۔ وہ کسی وقت بھی گھر آ سکتے ہیں۔"

کیا جھوٹ بول لینا سب کے بس کی بات ہے، میں سوچ رہا تھا۔

"آپ کو وہاں بھی کوئی پریشانی نہ ہوگی۔" مسز اگروال نے کہا "مسز خان ہم دونوں کی بہت اچھی فرینڈ ہیں۔"

"کون مسز خان.....؟"

"جس کے یہاں ہم چل رہے ہیں۔"

"اوہ.....!"

"بہت فاسٹ فرینڈ ہیں اور خاص کر کائنات اسے بہت مانتی ہے۔ آپ پریشان تو نہیں ہو رہے ہیں؟ تھوڑی دیر کی بات ہے۔ مشکل سے ایک آدھ گھنٹہ۔ اتنے میں کائنات واپس آجائے گی۔ پھر مسز خان کے یہاں سے کائنات کا مکان بھی نزدیک ہی ہے۔ وہ دیکھئے وہ رہا کائنات کا مکان..."

جب کائنات مجھے مسز اگروال کو سونپ کر جانے لگی تھی تب مجھے ایسی ہی کوفت ہو رہی تھی جیسے صاف ستھرے راستے پر چلتے ہوئے اچانک دَل دَل آگیا ہو اور میں گھٹنوں تک اس میں ڈوب کر پھنس گیا ہوں۔

ہم ایک چھوٹی سی عمارت کے لان میں داخل ہو رہے تھے۔ نیچی چھت والا وہ مکان چھوٹا اور سُبک تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر شوخ رنگ کے

پردے لٹک رہے تھے۔ بغل میں دروازے پر ایک چھوٹی سی نیم پلیٹ لگی تھی "کے۔ اے۔ خان" دستک دیکر مسز اگروال دروازے پر ہی چپک گئیں۔ میں ذرا دور تھا۔ دروازہ کھول کر کوئی شاید باہر آنا چاہتا تھا کہ ایک پل بھی دیر کئے بغیر مسز اگروال تیزی سے اندر داخل ہوگئیں۔ اس بار مسز اگروال نہیں کوئی دوسری عورت تھی۔ جوان اور تازہ سی۔ رنگ گہرا سانولا لیکن خوبصورت۔ اس نے چوکھٹ پر آکے مجھے آداب کیا۔ پھر مسکرا کر اندر آنے کا اشارہ کرتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔

ایک بالکل اجنبی آدمی کے ڈرائنگ روم میں اس کی اتنی ہی اجنبی بیوی کے ساتھ بیٹھنا۔ پہلے کچھ دیر بہت عجیب سا لگا۔ محسوس ہوا جیسے میرا سارا وجود ایک چھوٹی اور ہلکی گیند کی طرح ہو جسے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں اچھالا جا رہا ہے۔ مسز اگروال مشکل سے پانچ منٹ وہاں بیٹھی ہونگی مسز خان ہاتھوں میں سلائیاں اور اون کا گولا لے کر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں اور برابر سویٹر بننے لگیں تو میں نے سگریٹ کا سہارا لیا۔ کئی لمحے تک خاموشی رہی۔

"آپ چائے وائے پی کر فریش ہو لیں۔" مسز اگروال نے یکبارگی اٹھتے ہوئے کہا تھا "میں ذرا بہن جی کے یہاں چل کر دیکھوں کہ کیا حال ہے؟"

چائے اور ناشتے کا دور چلا۔ میں کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹے سے کئی بار چائے پینے سے میری زبان جلنے لگی تھی لیکن میں نے سگریٹ چھوڑا تھا اور نہ مسز خان نے سویٹر بُننا ہی!"

"آپ کی کہانیاں برابر پڑھتی رہتی ہوں۔" مسز اگروال کے جانے کے بعد مسز خان نے خاموشی توڑی۔

"جی شکریہ۔"

"آپ کی وہ کہانی بھی پڑھی تھی جو کائنات پر آپ نے لکھی تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟"

میں نے نام بتا دیا۔

"ہاں، ہاں وہی۔ بہت ہی پیاری کہانی تھی۔ آپ کے قلم میں کہاں سے اتنا درد آیا۔ سب سے پہلے کائنات نے ہی وہ کہانی پڑھوائی تھی۔ کوفت ہوئی اپنی محرومی پر کہ اب سے پہلے میں کیوں نہ آپ کو پڑھ سکی۔ آپ دونوں کی دوستی تو بہت پرانی ہے۔"

"گیارہ سال پرانی۔"

"دونوں شاید ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔"

"ہاں! ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے بھی تھے۔ جبھی میں نے کہانی لکھنا شروع کیا تھا۔"

"آج کل تو آپ دلّی میں ہیں؟"

"دو مہینے پہلے تک تھا۔ اب تو یہاں سے قریب ہی آگیا ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں، کائنات نے بتایا تھا۔ آپ تو ریسرچ بھی کر رہے ہیں؟ کیا مضمون ہے آپ کا؟"

"اردو ناول نگاری آزادی کے بعد!"

"آج تو آپ کائنات سے شادی کے بعد پہلی بار ملیں گے نا؟ عجیب بات ہے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی......"

"ایک بار اور مل چکے ہیں۔ کائنات ایک بار خود مجھ سے ملنے کے لیے میرے شہر آئی تھی۔ وہ بھی ملاقات بس رسمی سی تھی۔"

"اُف! دیکھئے نا۔ میں بھول گئی۔ کائنات نے یہ بات بتائی تھی۔ شاید آپ کسی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے شہر سے باہر جا رہے تھے؟"

"ہاں، جبھی کائنات نے وعدہ لے لیا تھا کہ میں اس کے گھر آؤں گا۔"

"آپ اپنی بیوی کو کیوں نہیں لائے؟ ملاقات ہو جاتی۔"

"آپ جو سوچ رہی ہیں ویسا میری زندگی کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں تو سدا سے کائنات میں کھویا رہا۔ عورت مجھے ایک فریب اور چھلاوہ لگتی ہے۔"

"لیکن...... کتنے دن کا پروگرام ہے؟"

"شام کی گاڑی سے لوٹ جانا چاہتا ہوں کچھ ضروری Appointments بھی ہیں۔ اچھا ایک بات بتایئے۔ کائنات ہمیشہ جمعرات ہی کو مجھ سے آنے کے لئے کیوں کہتی ہے؟"

مسز خان نے نگاہ اوپر کی۔ میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے تک مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر سر جھکا کر سلائیوں پر نظریں جما دیں۔ کئی لمحے بعد مسکرا کر بولیں۔ "یہ تو آپ کائنات سے ہی پوچھئے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں وہ دن ڈاکٹر ارشد کا بیزی دن ہوتا ہے۔ اس دن وہ آپریشن میں بیزی ہوتے ہیں اور دیر سے گھر لوٹتے ہیں۔"

"آپ کبھی ڈاکٹر ارشد سے ملے ہیں؟" مسز خان نے پوچھا

"جی! کبھی نہیں۔"

"کبھی دیکھا ہے؟"

سوال کچھ عجیب تھا۔ میں نے نفی میں گردن ہلا دیا۔

"میں آپ کو دکھاتی ہوں۔" کہہ کر وہ اٹھیں اور سامنے کی الماری سے البم نکالا اور اس میں سے ایک تصویر میرے سامنے رکھ کر اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔

یہ تصویر کائنات اور اس کے شوہر کی تھی۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ مسز خان کیوں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہی ہیں۔ وہ تصویر ایک ایسے جوڑے کی تھی جو کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ ڈاکٹر ارشد کے چہرے پر تو بصورتی ہی نہیں، خود اعتمادی اور خودداری کی بھی جھلک تھی۔

"دونوں ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں۔" وہ ہنستی ہوئی کہہ رہی تھیں۔ "کائنات بہت خوش قسمت ہے۔ ایک عورت کو اور کیا چاہیئے۔ ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر، اچھی خاصی سروس، دو پیارے بچے اور......."

یہ خبر مجھے جلانے کے لئے کافی تھی۔ جی میں آیا، مسز خان سے پوچھوں "تم عورتوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ایک مرد کو کیا چاہیئے؟" لیکن میں پوچھ نہ سکا کیونکہ مسز اگروال آ چکی تھیں، ایک چھوٹے بچے کے ساتھ۔ بتائے بغیر یہ ظاہر تھا کہ وہ کائنات کا بچہ ہے۔

"سبھی لوگ گئے؟" مسز خان نے پوچھا

"ہاں! ابھی ابھی ڈاکٹر ارشد بھی چلے گئے ہیں۔"

"اور کائنات؟"

"مکان پر ہے۔" مسز اگروال نے جلدی سے کہا۔ پھر جیسے کچھ یاد کرتی ہوئی مجھ سے بولیں "ارے! آپ چلئے۔ آپ کو کائنات نے بلایا ہے۔"

باہر آکر جب میں نے کائنات کا مکان وغیرہ سمجھ لیا تو مسز اگروال کے چہرے پر رخصت ہونے والی مسکراہٹ آئی، کاروباری سی۔ بچے کو گود میں لئے وہ اس سے کہہ رہی تھیں "آؤ بابا! ہم لوگ گھر چلیں۔"

ڈرائنگ روم میں ہم دونوں ایک ہی صوفے پر پاس پاس بیٹھے تھے۔

بات چیت کا ماحول کبھی کبھی بے کیف ہو جاتا تھا۔ کائنات کا آدھے سے زیادہ دھیان آنگن کی طرف تھا جہاں نوکرانی برتن صاف کر رہی تھی۔

جب میں پہنچا تو کائنات اپنے لڑکے کے ساتھ دروازے پر ہی ملی تھی اسے مسز خان کے گھر بھیج رہی تھی۔ کائنات نے مجھے بچے سے ملایا اور نہ سلام کلام کیا ایک پیار کے ساتھ بچہ کھیلنے کیلئے بھیج دیا گیا۔

"راشد! تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔" کائنات نے اسی شکایت سے میرا استقبال کیا۔ اندر سے آئی ' ایک بار پیار کیا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بولی "جانتے ہو کیسے؟"

"کیسے؟"

"ایک تو اتنی مشکلوں سے طویل مدت کے بعد تمہارا پتہ لگا۔ پھر قسمت سے تم پاس بھی آ گئے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں سوچتی تھی شاید اوپر والے نے میری سن لی ہے۔ دو مہینے بعد تمھیں آج خیال آیا ہے۔ وہ بھی کتنی آرزوؤں اور منتوں کے بعد...... نہیں...... نہیں...... شرارت مت کرو.."

"کائنات! تم جانتی ہو مجھے تنہائی راس آ گئی ہے۔"

"تمھیں کیا معلوم کہ کتنی مشکلوں سے تمھیں ڈھونڈا ہے۔ برسوں ڈھونڈتی رہی۔ پاگلوں کی طرح ان رسالوں کو کھنگالتی رہی جن میں تمھارے افسانے ہوتے تھے۔ پھر انھیں میں سے ایک دن قسمت سے تمھارا پتہ مل گیا اور.... .... یہ نوکرانی کتنی دیر کر رہی ہے؟"

"تم نے یہ سب خط میں لکھا تھا۔"

"ہاں' اور یہ بھی لکھا تھا کہ تم بہت دور ہو۔ کبھی بھولے سے بھی یاد کر لیا ہوتا۔

"راشد! تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ راشد نے تو شادی نہ کرنے کی قسم اسی دن کھالی تھی جس دن کائنات کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں جذبات سے بے قابو ہوکر وہ اپنی کائنات کا ہاتھ چومنا چاہتا تھا اور کائنات نے بہت ہی سفاکی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ جیسے میرے چومنے سے اس کے ہاتھ گندے ہو جاتے۔" میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ "تمہارے بغیر جینا بہت مشکل تھا کائنات! شہر چھوڑنے کے ایک ہی سال بعد تم مجھ سے دامن بچانے لگی تھی۔ انھیں دنوں تمہاری شادی کسی ڈاکٹر سے طے ہو گئی تھی اور تم پر یہ نشہ طاری تھا کہ تم کسی ڈاکٹر کی ہونے والی بیوی ہو۔ میں ڈاکٹر نہیں تھا نا.......... اور تم نے یہ بھی تو کہا تھا....."

کائنات نے ایک طویل سانس چھوڑ کر آنگن کی طرف دیکھا اور مجھے منانے کے سے انداز میں بولی "ان باتوں کو جانے دو راشد! حالات کے دباؤ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ سچ وہ ہے جو حالات ہمیں دیتے ہیں۔ پھر میں اس وقت کافی خوف زدہ بھی۔ دیکھو نا، لڑکیوں کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ......"

"لیکن، اب تو لڑکی نہیں رہیں۔ اب کیا ہو گیا؟" میں نے بات کے رُخ کو موڑ دیا

"کیا ہو گیا؟"

"اتنی ڈری اور گھبرائی ہو جیسے......"

"ہیں؟ نہیں تو۔ یہ نوکرانی چلی جائے تو میں یہ دروازہ بند کر دوں...

..... نہیں........ نہیں...... یہاں نہیں راشد! بیڈروم میں چلیں..

.... ہاں شاید میں تھک گئی ہوں۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو میں کیسے سہمی ہوئی سی سارا دن بھاگتی پھری ہوں......... اتنی ساری آفتیں ایک ساتھ..

.... ارے ہاں! دیکھو باتوں باتوں میں بھول ہی گئی۔ تم کیا لوگے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو......"

"کچھ بھی نہیں۔"

"مسز خان نے کافی کھلا پلا دیا ہے کیا؟"

جواب میں مَیں نے سَر ہلا دیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کس بارے میں؟"

"کسی بھی بارے میں۔ میرے، تمھارے، اپنے یا......"

"کوئی خاص بات نہیں کی۔ اِدھر اُدھر کی ہی باتیں ہوتی رہیں۔"

"میں دروازہ بند کر کے آتی ہوں۔" نوکرانی جا رہی تھی۔

دروازہ بند کر کے وہ میرے پاس آگئی۔ "راشد! تم مجھ سے ناراض ہو ناکہ میں نے تمھیں اپنا ہاتھ نہیں چومنے دیا تھا۔ لو۔ آج میرا پورا جسم تمھارے لئے ہے۔ میرے پورے جسم کو چومو۔ اب تو ناراض نہ ہوگے؟ مجھے چومو راشد! مجھے پیار کرو......"

اس کے بعد پھر نہ اسے خیال رہا اور نہ مجھے کہ ہم کون ہیں۔ کافی دیر بعد جب خیال آیا تو اس نے کہا

"راشد! مسز خان تمھیں کیسی لگیں؟"

"ٹھیک ہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"راشد! تم مسز خان سے شادی کر لو۔ بے چاری سہاگن ہوتے ہی بیوہ ہوگئی اور پھر وہ تمھیں چاہتی بھی بہت ہے۔"

●●

اسکائی لیب

"دیکھو بندو! میں تو اب ترس گیا ہوں ——— صرف بوسوں اور یہ لپٹا لپٹی سے میری سیری نہیں ہوتی ——— کوئی موقعہ......؟"

"تو تم کیا سمجھتے ہو رام؟ میرے دل کی بھی یہ خواہش نہیں جو تمھاری ہے۔ اگر ہم یوں ہی کوشش کرتے رہے تو کوئی نہ کوئی موقعہ مل ہی جائے گا۔"

"اب ٹالنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہر طرف شور ہے کہ اسکائی لیب ہمارے ہی شہر میں گرنے والا ہے، اور پھر ہم یوں ہی اپنی آرزو لئے مرجائیں گے۔"

"مگر.... کوئی موقعہ تو ملے۔ کوئی محفوظ جگہ بھی تو نہیں ہے۔"

"کل میرے گھر کے سبھی لوگ یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کسی رشتہ دار کے یہاں جا رہے ہیں۔ میرا گھر کل خالی رہے گا۔ تم کوئی موقع نکال کر وہیں آجاؤ۔"

"دیکھو رام! سب سے پہلے تم میری ایک لاکھ کی انشورنس پالیسی کرادو، تاکہ مرنے کا کوئی غم نہ رہے۔ کل انشورنس پالیسی کرادو گے نا؟"

"اچھا ڈارلنگ! کرادوں گا۔"

"رام: بڑی مشکل سے فرصت ملی ہے۔ تم نے میرا انشورنس کرادیا ہے نا؟

آؤ جلدی ہم اپنی آرزو پوری کرلیں۔ اسکائی لیب گرنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا ہے۔"

"یہ لو اپنی پالیسی۔ بھلا ہو اس اسکائی لیب کا جو بہت موقع سے گر رہا ہے۔ ورنہ پتہ نہیں کب تک ہم یوں ہی تڑپتے رہتے۔"

اس نے آگے بڑھ کر بندو کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ انکی سانسیں الجھنے لگیں۔ انھیں محسوس ہونے لگا جیسے ان کے اندر طوفانی لہریں سی اٹھ رہی ہوں اور وہ ان لہروں پر اس طرح بہے جا رہے ہوں جیسے تیز و تند موجوں پر ہچکولے کھاتی بادبانی کشتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو۔۔۔ اسکائی لیب گر چکا تھا۔ آسٹریلیا کے کسی مغربی حصے میں۔ آہ اسکائی لیب۔

●●

دردمند

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"رادھو!" اس نے جواب دیا۔ میلا کچیلا اور پھٹی لنگی پہنے رادھو ادھر ادھر بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ اس آٹھ دس سال کے صحت مند بھکاری بچے کی آواز میں پیارا سا لوچ تھا اور ایک عجیب اپناپن تھا۔

صبح اٹھ کر وہ اپنا زنگ آلود پلیٹ اٹھاتا اور بھیک مانگنے نکل پڑتا۔ بھیک مانگتے وقت اس کی آواز میں گڑگڑاہٹ ہوتی تھی۔ کوئی اسے جھڑک دیتا، کوئی نرمی سے صرف اتنا کہہ دیتا "معاف کرنا بیٹا، کسی اور جگہ سے مانگ لو۔" اور کوئی ترس کھا کر اس کی پلیٹ میں کچھ ڈال دیتا۔

رادھو کبھی کبھی ہمارے میس میں بھی آجاتا۔ میرے علاوہ کوئی بھی اس کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میس مینجر کو تو وہ ایک آنکھ نہ بھاتا وہ اسے دیکھتے ہی ڈانٹتے اور کہتے "اسی طرح کے لڑکے چور اور اچکے ہوتے ہیں ان کا پیشہ گھر گھر گھوم گھوم کر بھید لینا ہے تاکہ موقع ملتے ہی ہاتھ صاف کردیں۔"

ایک دن میں نے رادھو سے پوچھا "تمھارے گھر میں اور کون ہے؟ ماں ہے؟"

"نہیں....!" اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"بابا....؟"

"بہت دن ہوئے مر گئے۔"

"بھائی۔ بہن۔ بھی نہیں؟"

"کوئی نہیں ہے۔"

"تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ کام نہیں کر سکتے؟"

"کام کر سکتا ہوں۔" اس نے کہا "پر کوئی مجھے نوکر ہی نہیں رکھتا۔ آپ مجھے نوکر رکھیں گے؟"

"مجھے مکان مِل گیا تو میں تمھیں ضرور رکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔ یہ سُنکر اس کا چہرہ کھِل اٹھا۔

"کب لیں گے مکان؟"

"جتنی جلد مِل جائے۔" میں نے کہا۔

کبھی کبھی رادھو میرے پاس آتا اور پوچھتا کہ مجھے مکان ملا یا نہیں۔ میری زبان سے "نہیں ملا" سُن کر اس کا چہرہ اتر جاتا۔

پھر رادھو نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ بہت دن تک اس کا پتہ نہ چلا۔ خدا جانے کہاں چلا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ میں بھی اسے بھول گیا تھا۔

دو سال بعد

ایک دن وہ اچانک دکھائی دیا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھا کچھ گا رہا تھا۔ اسکے سامنے ایک کپڑے کا ٹکڑا پھیلا ہوا تھا۔ جس پر بہت سی ریزگاری پڑی تھی۔

دو سال پہلے اور اب کے رادھو میں کافی فرق تھا۔ وہ پہلے سے بہت موٹا ہو گیا تھا۔ جسم پر قمیص، نئی لنگی اور سر پر رومال باندھے ہوئے تھا۔ لیکن

دونوں پاؤں سے لنگڑا تھا۔ گھٹنوں سے نیچے اس کے دونوں پیر سوکھ گئے تھے۔ ہمارے میس کے مینیجر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم دونوں اس کے پاس کھڑے ہو گئے۔

"رادھو! تم لنگڑے کیسے ہو گئے؟ کیا بیمار تھے؟"

رادھو نے میری طرف دیکھا پھر کنکھیوں سے ادھر ادھر تاکا لیکن کچھ کہا نہیں۔ ایک دیہاتی آدمی نے جو رادھو کے قریب کھڑا تھا، مجھ سے پوچھا:

"ساب! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"جانتا تھا......"

"کیسے......؟"

"یہ ہمارے یہاں بھیک مانگنے آتا تھا لیکن اس وقت تو اس کی دونوں ٹانگیں ٹھیک تھیں۔ اب پتہ نہیں کیا ہوا اسے؟"

"کیا آپ اس کی کہانی نہیں جانتے؟ میں نے سنا ہے یہ تو اکھبار میں بھی چھپی تھی۔"

"میں نے نہیں پڑھا...... بتاؤ تو......"

"کیا کیجئے گا سن کر ساب! یہ بہت ہی دکھ بھری کہانی ہے۔ اسکے ماتا پتا مر چکے ہیں۔ یہ سارا دن آوارہ گھومتا اور بھیک مانگ کر پیٹ بھرتا تھا۔ ایک دن رادھو ریلوے ٹیشن پر بھیک مانگ رہا تھا کہ ایک اجنبی اسے بہکا کر گاؤں لے گیا۔ دن کو اسے وہ کمرے میں بند رکھتا۔ رات کو جب سب سو جاتے تو بھیک مانگنے کی شکسا دیتا تھا۔ اس کا منہ کپڑے سے بند کر کے اس کے پیروں پر ہتھوڑے مارتا تھا۔ آپ جانتے ہیں اس نے ایسا کیوں کیا؟" اس نے مجھ سے پوچھا اور میرے جواب کے بغیر ہی پھر کہنے لگا:

"اس کو لنگڑا بنانے کے لئے ـــــ تاکہ اس سے بھیک منگوا سکے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بھلے چنگے آدمی کو بھیک بھی نہیں دیتا ہے۔ لنگڑے اور لولے پر تو سبھی ترس کھاتے ہیں۔ وہ آدمی اس سے کہتا 'یہ صرف دو دن کا کشٹ ہے اسکے بعد تم دیکھو گے کہ جیون میں کتنا سُکھ ملتا ہے۔ پیر سے تو تم لنگڑے اور شیہ ہو جاؤ گے لیکن بیٹھے بیٹھے اپار دھن پایا کروگے' اور اب اس کی جو دشا ہے' دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"رادھو تمھارا رشتہ دار لگتا ہے کیا؟" میں نے اس سے پوچھا

"بہت نزدیک کا ساب۔ یہ میری بہن کا لڑکا ہے۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"ہمارا گھر پاس میں ہی ہے۔"

"کیا رادھو تمھارے ہی پاس رہتا ہے؟"

"اور کہاں رہے گا ساب۔ ایک لنگڑے کو کون پناہ دے گا؟ میں ہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔" ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اس نے کہا "کس کے گناہوں کا بوجھ کون اٹھا رہا ہے؟"

میں نے رادھو کو دیکھا۔ اس کے سامنے پڑے ہوئے کپڑے پر چار پانچ روپئے کی ریزگاری پڑی تھی۔ ہر روز ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ نہ جانے کیوں آج میرے ہاتھ رادھو کو پیسے دینے کے لئے نہ اُٹھ سکے۔ لیکن میں نے حیرت سے دیکھا کہ میس کے مینجر نے کچھ پیسے نکال کر کپڑے پر پھینک دیئے۔

●●

آدھے ادھورے

وہ اکیلی اس پار چلی جا رہی ہے۔ کہاں؟ اسے خود نہیں معلوم! شام کے پانچ بج گئے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تختے پر لپٹے ہوئے رنگین کاغذ کو ہٹانے میں ڈر لگتا ہے اور تحفہ...... مسز کابرا کو خود سے ڈر لگتا ہے۔ کاغذ پتلا ہے لیکن ایک کے اوپر ایک بے حساب۔ نہ جانے کتنی پرتیں ہیں۔ کب تک کوئی ہٹائے؟ مسز کابرا نے سوچا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی کہ ہوا آکر اس کی چھاتی سے لپٹ گئی۔ گلے میں لپٹے ساڑی کے آنچل نے دخل اندازی پیدا کی تو کھینچ کر آنچل نیچے گرا دیا سرگوشیاں کرتی ہوئی ہواؤں کو سنبھالے کہ آنچل! ہوا پاگل ہو چکی تھی۔ مسز کابرا کو دوڑنے کی عادت نہ تھی پھر بھی ہوا کا مچلنا نہ رکا۔ وہ کھڑی رہی لیکن ہوائیں جھک گئیں۔ ہوا کو اس سے ہمدردی تھی۔ آنچل ہاتھ میں سنبھالے مسز کابرا ہوا کے تھپیڑے سہتی کچھ دیر کھڑی رہی پھر جانے کیا ہوا کہ ہاتھ سے اس نے آنچل ڈھلکا دیا......

پانچ سال پہلے وہ مسز کابرا نہیں تھی۔ لیکن کیا تھی؟ مسز کابرا

بننے کی تیاری میں مشغول ایک معمولی لڑکی۔ آبھا کہتی تھی "ہر لڑکی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قیمتی پردوں کے نیم اندھیروں میں صوفوں اور قالین کے رنگ ملاتے ہوئے زندگی گذار دے۔ پتھر اور لکڑی کے چند ٹکڑوں پر کچھ رنگین ٹکڑوں کو گھو کھو کر پکارے اور ہر سال گھر کے سامان میں لوگوں کو دکھانے کے لئے اضافہ کرتی ہوئی ایک دن خود بھی بیش قیمتی سامان کا درجہ حاصل کر لے۔" آبھا کہتی تھی "ہر عورت کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے سے ایک چوتھائی دماغ والے آدمی سے شادی کرے اور عمر بھر اس کے کچھ جملے دہراتی رہے جو اس نے کتابوں سے چرائے ہوں!"

لہٰذا ایک دن آدما مسز کابرا بن گئی!

ایک معصوم اور نازک ہاتھ کا لمس اس نے اپنے کندھے پر محسوس کیا لیکن ایسا کچھ بھی اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ سامنے پتھر کی مانند کھڑا تھا، مسٹر کابرا! اس نے بار بار وہی جملہ دہرایا تھا "تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں! میں تمھارے ساتھ ہی رہوں گا زندگی بھر......

...." دور سے دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے تو احتجاج غصے میں بدل گیا۔ پاس آکر کیا سوچیں گے وہ لوگ؟ یہی نا کہ یہ لوگ کچھ غلط ہیں؟ .... پتی پتنی تو وہ کہیں سے ہی نہیں لگتے۔ مسز کابرا جھلا گئی اور پاس سے گذرتے لوگوں کو سنانے کے انداز میں کہا "میں تو تنگ آگئی ہوں۔ ایسی سڑی گلی زندگی سے!" پھر دیکھا مسٹر کابرا پتھر کی طرح کھڑے ہیں۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے پتی ہیں!

اس دن بھی گھر میں وہ کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔ کال بیل

بجی۔ دوپہر میں کون ہو سکتا ہے؟ دروازہ کھولا تو مسٹر کابرا کھڑے تھے۔

"پوچھا نہیں تم نے کہ میں کیوں آیا ہوں؟" دروازے پر کھڑے بوکھلائے سے انداز میں کہا تھا۔

"آئے ہو تو آئے ہی ہو! اس میں پوچھنے کی سی کیا بات ہے؟"

"میں اس لئے آیا ہوں... ... ..."

"تفصیل کی کیا ضرورت ہے؟ میں تم سے پوچھ نہیں رہی ہوں۔ تم آئے ہو کیوں کر آسکتے ہو اور باقاعدہ اپنا حق استعمال کرنے کے لئے... ... ...!"

"یہ بال لایا ہے مجھے... ... ...!" کابرا نے ہاتھ میں لئے ہوئے بال کو دکھایا۔ مسز کابرا سمجھ نہیں سکی کہ کس کا بال ہے اور کیوں بلا کر لایا ہے؟

"میری ٹائی پر لگا تھا... ... ..." کابرا نے کہا تھا۔

وہ سیدھے سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا "دفتر میں کام کرتے کرتے لگا کچھ گرمی ہے۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیک کرنے لگا تو یہ بال دیکھا اور ایک دم اٹھ کر چلا آرہا ہوں!" ایسے کہہ رہا تھا جیسے کسی کا قتل کرنے کے بعد کسی کو اپنے ہاتھوں میں خون کا داغ دکھائی دے گیا ہو۔

"تمھاری ٹائی تک تمھارا بال کیسے پہونچ سکتا ہے؟"

"یہی تو میں بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں!" اس نے تائید کی اور خود پریشان بھی ہوا کہ یہ کیسے ہوا؟ مسز کابرا بیٹھی اس کے بھولے پن کا مزہ لے رہی تھی۔!

ڈھلتی ہوئی شام کے سائے میں اس نے دیکھا وہ فیصلے کا منتظر تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ زندگی بھر ساتھ رہنا ہے لیکن ایک چھت کے نیچے رہنے کو تیار نہیں۔ بھوک لگی ہے لیکن منہ نہ کھولوں گی جیسی ضد لئے بیٹھی تھی۔ وہ جھنجھلا گئی۔

آج وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اپنے ساتھ کو دوبارہ رینو کرنے کی دھن، اعتماد، سب کچھ چہرے پر ابھر رہا تھا۔ لگا جیسے وہی کہیں غلط تھی۔ دونوں کی مس انڈر اسٹینڈنگ ہی زیادہ تھی۔

پاس بیٹھے وہ آگے کے منصوبے بناتے رہے۔ اتنے دن وہ اس کے بغیر کیسے رہی، وہ سمجھ نہیں سکی۔ یہ بات وہ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ نہیں ملے۔ اس نے اس کو کتنا بدنام کیا، کتنے اتہامات لگائے، سب بھول چکی تھی۔ مسز کابرا کا سر کابرا کے کندھے پر تھا۔ چند لمحوں کے لئے وقت رک گیا تھا۔ اس نے کہا "اب کبھی نہیں کرنا پہلی جیسی بات...... .... !"

گزشتہ سال لوگ مسٹر کابرا کے بارے میں اس سے پوچھتے تھے۔ کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ اس کے پاس خاموشی کے علاوہ اور کوئی جواب بھی تو نہیں تھا۔ آج جب کہ ایک موقع تھا جسے خود آگے بڑھ کر کابرا نے اسے دیا تھا تو وہ کترا رہی تھی!

اچانک اندھیرے میں وہ اس کے پتھر جیسے سینے سے جا لگی ــــــ

ــــــ "اور کیسے کیوں؟" برسوں کی تنہائی ایک جملے میں پھوٹ پڑی تھی!

اور پھر وہ پہلے کی طرح واپس چلے گئے...... ... ...

تھکے ہوئے قدموں سے چلتے چلتے اپنے گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھتے لگا، جیسے دن بھر وہ تاش کے پتوں سے گھر بناتے رہے ہوں!!

●●

چاندنی رات کے میخوار

آج کچھ زیادہ پی لینے سے رادھو کے پاؤں کچھ زیادہ ڈگمگانے لگے
دل کچھ زیادہ دھڑکنے لگا اور ہونٹ کچھ زیادہ ہی کانپنے لگے۔ لڑکھڑاتے
پاؤں اور بہکی ہوئی آواز دل کی زندگی ہزار رنگوں میں وہاں جلوہ گر تھی۔
مہاجنوں کی نگری میں ایک بھکاری گھومنے لگا۔ بھکاریوں کے شہر میں ایک
شہنشاہ کی طرح!

دل کے پنجرے سے اڑا پنچھی کھلے آکاش میں اڑانیں بھرتا ہوا پوری
دھرتی کو نظر انداز کرنے لگتا ہے۔ دھرتی کے بہت سارے سوالوں سے
منہ پھیرتے ہوئے ایک ایسا ہی پنچھی اس دن کھلے آسمان میں چکر لگانے لگا تھا
خوشیاں بھی غریب ہوتی ہیں دل بھی بھکاری ہوتا ہے۔

پتہ نہیں سب سے پہلے کس نے ہلکے گھونگھٹ کے پار گوری کا چاند
سا مکھڑا دیکھ کر بے وجہ چیخ چیخ کر شور مچا دیا تھا۔ بنٹی غور سے رادھو کا چہرہ
دیکھتا رہا، مسکراتا رہا اور پھر بھٹی کے نیچے زور سے ہنس پڑتا ہے۔ چھوکرا سوچتا
ہے ڈیڑھ بوتل کا کاکا دو گلاس کے بھتیجے سے کتنی دور نکل گیا ہے۔ چند لمحے

خاموشی سے گھورتے رہنے کے بعد رادھو نے بنٹی سے کہا "بنٹی! میرا بیاہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

بنٹی کی آنکھیں حیرت سے نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ اس نے حیرت سے کہا "اس عمر میں کاکا؟" رادھو شرمندہ نہ ہوا۔ اس نے قصبے کے کئی سن رسیدہ لوگوں کی شادی کی مثال دی۔ ڈھلتی عمر میں ہوئے ان کے بچوں کا ذکر کیا اور پھر کہا "ابھی تو میری ڈور بہت مجبوت ہے رے! ابھی ہوا کا ہے؟ ایک بال بھی سفید دکھتا ہے؟" اور پھر رادھو نے بنٹی کو بتایا کہ ایک دن اس نے کچہری روڈ پر ایک جیوتشی کو ایک روپئے پچیس پیسے دے کر اپنا ہاتھ دکھایا تھا۔ جیوتشی نے اس کے ہاتھ کی ریکھاؤں کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی قسمت میں گھرگرہستی بھی ہے اور بال بچے بھی۔

بنٹی بہت دھیان سے رادھو کی باتوں کو سنتا رہا۔ اور رادھو کے چپ ہوتے ہی پوچھا، "تو ہمیں جوشی کی باتوں پر وشواس ہے کاکا؟"

"ہاں رے! کیوں نہیں!" رادھو نے سنجیدگی سے کہا "وہ جھوٹ نہیں کہتے۔ ہاتھ کی ریکھاؤں میں سب کچھ لکھا رہتا ہے۔ جوشی انھیں پڑھ لیتے ہیں!"

"ہاں کاکا! جوشی بھلا جھوٹ کاہیں بولیں گے؟ پھر تو تم بیاہ کر ہی لو!" اس بار رادھو زور سے ہنسا۔ وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا "چل بنٹی اب گھر چلیں!" رادھو اپنی جھونپڑی میں گھسنے کو ہوا تو بنٹی نے کہا "تم سو جاؤ کاکا! میں ذرا گھوم کر آتا ہوں!"

رادھو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر آنے کو کہا "پہلے

میرا ایک کام کر دے !"

"کون سا کام کاکا !" بنٹی نے حیرت سے پوچھا۔

اندر جا کر بنٹی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ رادھو نے چھت کی پھوس سے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ اس میں ایک انگوٹھی تھی۔

"کیا کام ہے کاکا ؟" بنٹی کی گھبراہٹ بڑھ گئی تھی "یہ تو انگوٹھی ہے !"

"اسے تو دینا کو دے آ !"

"دینا کو۔ کیوں کاکا ؟"

"چیکھ مت ! آہستہ بول !"

"دینا کو کاہے دو گے کاکا ؟" اس بار بنٹی نے سرگوشی کی۔

"تو بھول گیا ؟ میں نے تجھے اپنے بیاہ کی بات نہیں کہی تھی ؟"

"دینا سے بیاہ کر دگے ؟"

"پہلے بات تو پکی کر لوں، تمھیں تو میری اس عمر پر بھی اعتراض ہے۔ دنوں دن عمر تو بڑھتی ہی جائے گی۔ گھر والی نہ ہو تو گھر سدنا سونا لگتا ہے۔ مر کھپ کر آتا ہوں تو کوئی پاؤں دبانے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ !"

"پاؤں تو میں بھی دبا سکتا ہوں کاکا ! تم اس کی چنتا کیوں کرتے ہو اور دینا تو تمھارا پاؤں نہ دبائے گی یہ جان لو !"

"پاؤں نہ دبائے گی لیکن ہم دونوں کے لیے کھانا تو بنائے گی ؟"

"دینا تو چھوری ہے۔ خود ادھر ادھر سے جاتی پھرتی ہے۔ وہ تمھارا کھانا بنائے گی۔ اس امید میں تو مت رہو !"

"کسی امیر پری تو بیاہ کر رہا ہوں رے۔ تو بات کیوں نہیں سمجھتا؟ کھانا نہ بنائے گی تب بھی کوئی حرج نہیں۔ گھر کی دیکھ بھال تو کرے گی!"

"وہ تو ایک آنکھ کی کانی بھی ہے کاکا!"

"لنگڑی لولی سے تو اچھی ہے۔ اس بستی میں تو ہر ایک کا شریر گلا سڑا ہے۔ سب کے شریر سے گندھ آتی ہے۔ یہاں کس کی عورت دینا جیسی ہے!"

"لیکن کاکا! وہ تمھارے بس میں رہے گی، مجھے سندیہہ ہے!"

"رہے گی... ... ... رہے گی... ... ... ننھی! جب کھونٹ سے بندھ جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک بچہ ہو جائے تو پھر دیکھنا دینا کس طرح جھک کر رہتی ہے۔!"

"یہ تو تم جانو کاکا! مجھے تو جو کہو گے وہی کر دوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے! تم یہ انگوٹھی لے کر جاؤ۔!"

جانے سے پہلے ننھی نے پوچھا "دینا کے باپ سے تو بات کر لی ہے نا!"

"نہیں رے! اس کے باپ سے کیا بات کروں گا۔ اس سے کچھ نہ ہوگا!"

"اس کے باپ سے نہیں پوچھا ہے؟" جھوکرے نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "تب ضرور تم نے دینا کو پھسلایا ہے کاکا!"

"کیوں رے! دینا مجھ پر ڈورے نہیں ڈال سکتی کیا؟" رادھو

نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بس .... بس یہی بات ہے۔ اب سمجھ گیا میں!"

"اب جاؤ بھی۔ کہنا میں نے بلایا ہے!"

"ابھی ....؟"

"ہاں ...." پلک جھپکاتے ہوئے رادھو نے کہا اور پوچھا "کتنی دیر میں آجاؤ گے؟ معلوم ہے نا وہ کہاں ملے گی؟"

"ہاں .... اسٹیشن چوک پر!"

"ٹھیک ہے! ڈھونڈ تو لو گے؟ ساتھ ہی لے کر آنا۔ اکیلے مت لوٹنا!" پھر رادھو نے اس سے پوچھا "دینا سے کیا کہو گے؟"

"اسے انگوٹھی دے دوں گا اور یہاں آنے کو کہوں گا۔"

"اور کچھ نہ کہو گے؟"

"اور کیا کہوں گا؟"

"پوچھے گی، انگوٹھی کیوں دی ہے، کیوں بلایا ہے؟"

"بیاہ کی بات پکی کرنے کو ہی تو؟"

"بس اتنا ہی کہو گے؟"

"تم مجھے بتا دو اور کیا کہنا ہوگا! میں سب کہہ دوں گا!"

"تمہیں یہ تو بتانا ہی ہوگا کہ وہ میرے گھر میں سکھ سے رہے گی یا دکھ سے!"

"ہاں یہ تو کہوں گا ہی کہ وہ تمہارے گھر میں سکھ اور آرام سے رہے گی!"

"ایک بات اور جان لو بنٹی! میں اسے بھیک نہ مانگنے دوں گا۔"

"ہاں کاکا! تم تو خود ہی بہت کما لیتے ہو۔ پھر اسے بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ سب اس سے کہہ دینا!"

"ہاں، ہاں یہ سب تو کہنا ہی ہے!"

"یہ بھی اس سے کہہ دینا میں اسے کسی بات کی کمی نہ ہونے دوں گا۔ میں بھکاری ہوں تو کیا ہوا اسے پری بنا کر رکھوں گا!"

"میں اسے جوشی کی بات بھی بتا دوں گا۔ وہ دوڑی ہوئی چلی آئے گی۔ اس کی ایک آنکھ پتھر کی بنوا دینا کاکا!"

جواب میں رادھو مسکرا دیا تو بنٹی نے سنجیدگی سے کہا "ہنسو مت کاکا! بڑی کوٹھی والے بابو کی بھی ایک آنکھ پتھر کی ہے۔ دور سے کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔"

"اتنے پیسے ہوں گے تو وہ بھی کر دوں گا۔ اب تو جا!"

ادھر بنٹی بستی سے باہر ہوا اور ادھر رادھو کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ان دھڑکنوں کو گن کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ وینا کی قسمت اب چمکنے والی ہے اور رادھو کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شادی کی پالکی میں بیٹھ چکا ہے۔ کہاروں نے پالکی اٹھا لی ہے اور اب بستی کے اس پار پالکی اترنے ہی والی ہے۔ فرط مسرت سے اس کا جسم کانپ گیا۔

وہ خیالات میں کھو گیا ———— کوئی اس سے کہہ رہا ہے

آؤ رادھو اب اپنی بستی کہیں اور بسالو۔ اس گندی بستی سے نکل
چلو۔ کسی دن ایک تیسرا بھی آجائے گا۔ جب وہ چاند کے لئے ذکر کرے
گا تو رادھو آکاش سے چاند توڑ کر لا دے گا۔ کتنا اچھا ہوتا سپنے بازاروں
میں بکا کرتے۔ تب ہر کوئی انھیں خرید تو نہ پاتا۔ آج ویسے بھی رادھو
پر شراب کا نشہ چڑھا ہوا تھا اور وہ بری طرح بہک رہا تھا۔

بنٹی اب پہونچ گیا ہوگا۔ دینا اسے مل گئی ہوگی۔ دینا کو وہ اندر
سے بلا کر اس سے باتیں کر رہا ہوگا.................. انگوٹھی دیکھتے
ہی دینا کو اس دن کی بات یاد آ گئی ہوگی۔ میں نے اس سے کہا تھا
ایک انگوٹھی پہن لو تو تم اور سندر دکھنے لگوگی۔ دینا ہنس کر آگے
بڑھ گئی تھی .... وہ اب انگوٹھی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی
ہوگی۔ انگوٹھی پہن کر ضرور اس نے بنٹی سے پوچھا ہوگا "کیسی لگتی ہوں؟"

"بہت سندر!"

"بہت سندر!" رادھو کے منھ سے بے ساختہ نکل پڑا۔ بنٹی نے
بھی ضرور یہی کہا ہوگا "بہت سندر!"

دینا اب آرہی ہوگی ... ... رادھو اپنا بستر ٹھیک
کرنے لگا۔ بستر پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ نشہ سے اس
کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ہر آہٹ پر وہ ہوشیار ہو جاتا اور اس
کی نگاہیں دروازے پر جم جاتیں!

بہت دیر کر دی بنٹی نے! نہیں۔ دیر دینا نے لگائی ہوگی
اپنے جوڑے میں لگانے کے لئے پھول ڈھونڈ رہی ہوگی۔ وہ جانتی ہے

ہے مجھے پھول بہت پسند ہیں۔ اس دن جب وہ اپنے جوڑے میں پھول لگائے گذر رہی تھی تو میں نے ٹوک ہی دیا تھا۔

"یہ پھول تمھارے جوڑے میں بہت اچھا لگتا ہے دیپا!" دیپا سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات کی پہلی مسکراہٹ پر رادھو ہزار جان سے مرمٹا۔ سب کچھ یاد ہو گا دیپا کو!

اس بار دروازے پر اندھیرے میں کوئی تھا۔ بنٹی سامنے تھا تنہا! کیا دیپا بعد میں آئے گی؟ بنٹی دروازے پر رکے بغیر اندر آ گیا۔ رادھو نے پوچھا "کیا ہوا بنٹی؟"

بنٹی نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا "اس کی بات مت کرو کاکا!" جیسے کسی بچے نے رادھو کو ڈانٹ دیا ہو۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا۔

"تم نے اس سے کیا کہا؟" رادھو نے اپنی آواز کو ذرا بھی کلپنے نہ دیا۔

"اسے انگوٹھی دے دی، اور جو کچھ تم نے سکھایا تھا سب کہہ دیا!"

"کیا کہا اس نے؟"

"انکار کر گئی کاکا! صاف انکار!"

"تم نے اس سے یہ تو بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ اس کے سارے دکھ ختم ہو جائیں گے؟"

"بہت اچھی طرح سے کہا تھا!"

"یہ بھی کہ میرے گھر میں وہ رانی کی طرح رہے گی؟"

"یہ تو میں نے بار بار کہا!"

"اور کیا کہا تم نے؟"

"میں نے اس سے کہا کہ رادھو کاکا ایسا جوڑا پوری بستی میں اسے نہ ملے گا۔ تم تو بھاگوان ہو جو رادھو کاکا تم سے بیاہ کرنے کو تیار ہیں!"

"پھر کیا کہا اس نے؟"

"اس میں اینٹھ بھی تو کم نہیں ہے کاکا! کہنے لگی "میں اس رادھو سے بیاہ نہ کروں گی۔ مجھے اس کے کھیگھا سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے جھوٹ کہا۔ کھیگھا سے کیا ڈر لگے گا؟ بولے، لنگڑوں کے ساتھ دن رات کو ٹھے مٹکاتی پھرتی ہے اور تمھارے کھیگھا سے اسے ڈر لگنے لگا!"

ایسی گالی آج تک کسی نے رادھو کو نہیں دی تھی۔ انگوٹھی آگے بڑھاتے ہوئے بنٹی نے کہا "بھگوان جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ دینا تو بدچلن ہے کاکا! ایک نمبر کی حرافہ! بس یہی سمجھو کاکا بھگوان نے تمھیں بچا لیا۔ وہ دکھ سکھ میں کبھی کام نہ آتی۔"

رادھو بالکل خاموش سنتا رہا۔ اس کا دھیان ان بے شمار آنکھوں کی طرف چلا گیا جو بازار میں خوف اور دہشت سے اس کی طرف اٹھتی ہیں۔

"اور کانی بھی تو ہے۔ سویرے سویرے اٹھ کر اس کی کانی آنکھ دیکھو گے؟ کاکا! تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ کتنا اشبھ ہوتا ہے؟"

رادھو اور کچھ بہت خاموشی سے سنتا چلا جاتا۔ لیکن اس کے کان دینا کی پچھلی ہنسی کی طرف تھے۔ جب دینا ہنستے ہوئے اس کے آگے سے

گذر گئی تھی وہ ضرور اس کے گھیگھا پر ہنسی ہوگی۔

منٹی کو نیند آنے لگی۔ وہ سونے کو ہوا تو رادھو نے اپنی خاموشی توڑی۔ "دیکھ بیٹی! بھگوان نے مجھے دولت نہیں دی، ودیا نہیں دی، ماں باپ کے مرجانے پر کسی کا سہارا نہیں دیا، پھر بھی ایک سہارا دے دیا کہ کما کھا لیتا ہوں۔ بھکاری تو یہاں سب ہیں۔ میرے تو آنکھ کان بھی درست ہیں۔ ہاتھ پیر ٹھیک ہیں۔ لولا، لنگڑا نہیں ہوں۔ کوڑھیوں کی طرح میرے سر پر مکھیاں نہیں بھنکتیں، کسی پیڑ اسے رات بھر چلاتا بھی نہیں ہوں۔ اور بھکاریوں کی حالت دیکھ لو، لیکن پھر بھی کسی سے کما تا کم ہوں؟ ایشور نے گلے میں ایسی گٹھری باندھ دی ہے کہ پانچ، دس روز کما ہی لیتا ہوں!"

"ہاں۔ کاکا!"

"اس کانی کے لئے اپنا گھیگھا کٹوا دوں گا کیا؟ ایشور کی دی ہوئی یہ دولت ہے میرے پاس۔ سالی اس سے نفرت کرتی ہے۔ ایسی عورت سے کیا بیاہ کیا جا سکتا ہے۔ بنٹی؟"

"نہیں کاکا! اور پھر وہ تو بڑی چھناں ہے۔"

"ہاں رے ہاں! وہ کانی بھی تو ہے۔" ــــ ایک لمحہ کیلئے خاموشی چھا گئی۔ پھر رادھو نے بنٹی سے پوچھا "سچ سچ بتا بنٹی! کیا یہ گھیگھا تمھیں بھی بُرا لگتا ہے؟"

چھوکرے نے ہنستے ہوئے جواب دیا "نہیں کاکا! تم کیسی باتیں کرتے ہو؟" اور پھر اسکے گھیگھا کو ہتھیلی سے سہلاتے ہوئے کہا "مجھے کیسے بُرا لگے گا؟ بھگوان کی دی ہوئی دولت ہے۔ اسی کی کمائی تو میں بھی کھاتا ہوں۔ میں خود بھگوان سے مناتا ہوں کہ ہے بھگوان! سڑے گلے بھکاریوں کی طرح میرے ہاتھ پیر مت سڑانا۔ بس رادھو کاکا کی طرح مجھے بھی ایک گھیگھا دے دینا۔"

● ●

غم کی دہلیز پر

تم اس وقت میرے پڑوس میں رہتے تھے۔ خواہشات کے بھی عجیب روپ ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے تمھیں اتنا پریشان کروں کہ تم رونے لگو اور پھر تمھارے آنسوؤں کو اپنے آنچل میں جذب کر لوں۔ میں خیالات کے اندھیروں میں ڈوب گئی اور تم چلے گئے۔ اتنے دور چلے گئے ______ کہ تمھیں پانا دور کی بات تھی تمھیں محسوس کرنا ہی مشکل ہو گیا۔ یہ تنہائی بھی کتنی روح فرسا ہوتی ہے، عجیب آزار ہے یہ اکیلاپن۔ دور دور تک سناٹا چھایا رہتا ہے۔ حدِ نگاہ تک خاموشیوں کے صحرا پھیلے رہتے ہیں۔ صرف سانس کی آواز گونجا کرتی ہے۔ بس اسی آواز کے سہارے وقت گزرتا رہتا ہے

کتنی عجیب ہے یہ زندگی!

عجیب ہے یہ زندگی!

تلخ!

پیچیدہ!!

جاں گسل!!!

نہ جانے کیوں درد کی لہروں میں آج یہ خوفناک تموّج پیدا ہو گیا۔

ابھی ڈاکیہ تمھارا خط دے گیا ہے۔ لکھا ہے " پوری زندگی میں صرف ماضی کا ایک معصوم ٹکڑا ہی میں نے اپنے نام رکھ چھوڑا تھا۔ معصوم اس لئے کہ اس وقت میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ میں ... ... سب کچھ بے نام و نشان تھا۔ اس ماضی کو کوئی نام دے سکتا اس سے پہلے ہی سب کچھ چھوٹ گیا تھا۔"

تم نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ اس وقت میرے پاس بھی الفاظ نہیں ہوا کرتے تھے۔ بس اپنی دنیا میں گم۔ لارڈ ٹینی سن، ورڈس ورتھ اور رابرٹ براؤننگ کی موٹی موٹی کتابوں میں کھویا رہنا، دستاویزوں میں گم، ڈپارٹمنٹ میں ٹاپ کرنے کی دھن، منورما کو شکست دینے کی تیاری! یہی تو میری زندگی تھی۔

اس دن پہلی بار اس لڑکے نے میرے گھر آکر مجھے چابی دی تھی "بی بی جی یہ چابی!" وہ دس بارہ سال کا خوبصورت لڑکا تھا۔

"کیسی چابی، کس کی چابی؟"

"وہ ... ... وہ سامنے والے چھوٹے بھیا کی!"

"میں کسی بھیا بھابھی کو نہیں جانتی۔"

"آپ کی ممی جانتی ہوں گی؟"

"وہ میری ممی نہیں بھابھی ہیں۔ تو اپنے کس بھائی کی چابی لایا ہے؟"

"جی ——— " وہ شرما گیا " وہ صاحب نہیں کہنے دیتے۔ ابھی پڑھ رہے ہیں نا!"

"اوہ! ٹھیک ہے۔ چابی رکھ دے اپنے رشتہ دار کی!"

"جی! اپنی بھابھی سے کہہ دیجئے گا وہ شام کو مانگنے آئیں تو دیدیں گی!"

"دے دوں گی .... دے دوں گی..... ..... جا بھاگ!"

تو وہی تاروں کی جالی والی کھڑکی۔ اس کمرے میں کچھ خاص سامان تو نہیں۔ بے ترتیب سی پڑی ہوئی کچھ میزیں۔ کھڑکی کے پاس ایک میز پر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کتابوں کے بوجھ کے درمیان مدفون سا چہرہ۔ میز پر ایک ٹائم پیس ہوتی ہے۔ بس یہی تو اس کمرے کی جاگیر ہے اور زیادہ کچھ تو نہیں جسے یاد کیا جائے۔ خیر چھوڑو۔ اپنے کو اس سے کیا مطلب۔ آؤ پڑھیں۔ ڈپارٹمنٹ ٹاپ کرنا ہے۔ منورما کو شکست دینا ہے!

"مدھو ....!" بھابھی نیچے سے آواز دیتی ہیں "کوئی چھوٹا لڑکا صبح چابی دے گیا تھا کیا؟"

"ہاں .... ہاں..... ..... رکھی تو ہے میز پر!"

"اور تم نے بتایا نہیں۔ وہ بے چارہ لوٹا جا رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے نہیں معلوم ...."

ہاں ہاں وہی ہلکے ہلکے کریم کلر کی شرٹ پہنے بے ترتیب زندگی جینے والا۔ میری ہی طرح اسے بھی ضرور کسی کو شکست دینی ہے یا ڈپارٹمنٹ ٹاپ کرنا ہے۔ اسی لئے تو بہت رات گئے میز کے پاس کرسی کھسکانے کی آواز آتی ہے اور میری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ جا کر بالکنی پر دیکھتی ہوں تو پتہ چلتا ہے حضرت اب سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ لیمپ کا سوئچ دباتے ہی روشنی کا خون ہو جاتا ہے اور میری نیند بھی غائب ہو جاتی ہے۔ کوئی بات نہیں اب میں پڑھوں گی۔ اس طرح نیند کھل جانے پر تکان بھی نہیں ہوتی اچھا ہے اپنے سونے سے پہلے انجانے میں جگا دیتا ہے۔ ڈپارٹمنٹ ٹاپ کر گئی تو ہنومان جی کے بعد سوا پاؤ لڈو اس کے چرنوں میں بھی بھجوا دوں گی۔ ہاں۔

——— مدھو انجانے میں بھی کیے گئے احسان کو بھولتی نہیں ہے۔ ابھی تو اسے معلوم بھی نہ ہو گا کہ مدھو کس چڑیا کا نام ہے۔ جب لڈو جائیں گے تب اپنی مزار سے نکل کر پوچھے گا کہاں سے آئے، کس نے ثواب کیا کون مدھو!

گرد و پیش کی کوئی خبر ہی نہیں۔ بالکل میری ہی طرح۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کس ایر میں ہے یا ریسرچ کر رہا ہے؟ اس کی وہ کریم رنگ کی شرٹ ... ... مجھے کچھ نہیں معلوم۔

... ... معلوم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

"اوہ تم! چابی دینے آیا ہے تو گھنٹی بجا کر آنا چاہیئے۔ معلوم ہے کہ نہیں؟"

"جی، معلوم ہے!"

"پھر... ... ...؟"

"چھوٹے بھیا نے کہا ہے کہ گھنٹی بجا کر پڑھنے میں خلل نہ ڈالا کرو۔"

"یہاں کی گھنٹی بجنے پر وہاں ان کے پڑھنے میں خلل پڑتا ہے؟"

"ان کے نہیں... ... ... آپ کے!"

"میری... ... ... !" میں گھبرا کر رہ گئی۔

نا تمی آئی تھی۔ چلو نہ چھت پر آج Lord Temnyson کو پڑھا جائے۔

THE FLOOD MAY BEAR ME FAR

I HOPE TO SEE MY PILOT FACE TO FACE

WHEN I HAVE CROST THE BAR.

"رک...... رک ... . یہ کون ہے؟" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اس زمین پر رہنے والے ہزاروں لاکھوں کی طرح ایک آدمی یا لڑکا جو بھی کہہ لو۔"

"وہ تو دیکھ رہی ہوں...... ... ... لیکن... ..." تھوڑا رک کر بولی "تیرے گھر میں آنا جانا نہیں کیا؟"

"ہوتا ہے۔ بھابھی کے ساتھ۔ چابیاں، شکریہ، معاف کریں اور بلیزروں کا تبادلہ!"

"اتنا سنبھل سنبھل کر کیوں بول رہی ہے؟" وہ تیکھی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہے۔

"یہ تیرا ذہنی فتور ہے ——"

"یا تیری...... ..."

"تیرا سر... ... ... مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں!"

"جانتی ہوں... .... مثلاً ڈیپارٹمنٹ ٹاپ کرنا، منورما کو شکست دینا!"

"معاف کیجئے گا! مجھے چابی لینی تھی ذرا!" میں چونک گئی۔

ہاں وہی لیمپ کی روشنی کے گول دائرے میں مدفون رہنے والا چہرہ میرے سامنے تھا۔

"کہاں ہے چابی! ذرا پوچھیں گی کیا؟"

"جی...... ... ... جی .... یہ رہی چابی... ......"

میں نے بے حد بے پروائی سے چابی اس کی طرف اچھال دی اور پہلے کی طرح نوٹ بک پر جھک گئی۔

"بہت بہت شکریہ!"

میرے دماغ کو ایک گہرا دھچکا لگا۔ اپنی اس حرکت پر مجھے غصہ بھی آیا۔ میں اپنے آپ سے جھگڑتی رہی۔ نوٹس اتارنے میں مشغول تھی مجھے اور کسی بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے چابی مانگنے کے علاوہ اور کچھ نہ پوچھا اور میں نے چابی دینے کے علاوہ اور کچھ نہ کہا۔

لیکن..........

اس وقت سے میں ایک گمنام رشتے سے بندھ گئی۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اب صرف مدھو نہیں ایک جادوگر کا پٹارہ ہو گئی ہوں۔ اس میز پر پڑھائی ہو چکی۔ چھت پر ٹہل ٹہل کر پڑھائی ہو گی۔

سورج ابھی ابھی ڈوبا ہے۔ یہ سنہرا سا رنگ........ ایسا ہی رنگ تھا اس کی شرٹ کا........ اونہہ........ مجھے اس سے کیا........ بس یوں ہی یاد آ گیا........ اور کوئی خاص بات نہیں........

سلسلہ پھر ٹوٹ جاتا ہے۔ نگاہیں اس کھڑکی پر جم جاتی ہیں۔ کس طرح کمرے میں سامان بکھیر رکھا ہے۔ اچھا اگر ماں لو وہ پھر چابی مانگنے آیا اور میں میز پر ہی نوٹس بناتی رہی اور اس نے کچھ پوچھا تو جواب ٹھیک سے دوں گی نا؟ وہ تھینکس کہے گا تو میں بھی اپنی طرف سے اٹس آل رائٹ کہہ دوں گی۔ لیکن........ وہ آئے چابی مانگنے...... تب تو........

بھابھی اس لڑکے سے کہہ رہی ہیں "وہ تو گئے۔ ان کے گھر سے ٹیلی گرام آیا ہے۔ تمھیں آنے کو منع کر گئے ہیں جب وہ آئیں گے تو تمھیں بلوالیں گے۔"
اس لڑکے نے سر ہلا دیا۔ لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اداس اور غمگین ہو گیا ہے۔

میں بالکونی پر کھڑی اس لڑکے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یکبارگی خیال آیا کہ اسے پکار کر بلالوں اور اس سے پوچھوں کہ اس وقت وہ کیا سوچ رہا ہے۔ لیکن اف! مجھے تو منورما کو شکست دینا ہے۔ ڈپارٹمنٹ ٹاپ کرنا ہے!

اور اسی طرح ______

صبحیں گذرتی جاتی ہیں شامیں ڈھلتی جاتی ہیں۔ ویسے بھی کچھ خاص احساس نہیں۔.... .... لیکن ذرا عجیب لگتا ہے۔ ہفتوں گذر گئے۔ آخر ہوا کیا؟

پھر ایک دن کالج سے لوٹتے ہوئے دیکھا اس کی کھڑکی بند ہے۔ میری بے چینی بڑھ گئی۔ آ گئے تم کیا؟ کل صبح لڑکا چابی دینے آئے گا۔ آج بھی تو تم شاید چابی رکھ کر گئے ہو گے اور تب شام کو شاید لوٹ کر لینے کے لئے آؤ۔ زینے پر چڑھتے ہوئے کان جیسے کسی آہٹ کے منتظر ہوں لیکن کہیں کچھ نہیں۔ بھابھی نے صرف اتنا ہی کہا "آ گئیں، چائے بناتی ہوں" کمال ہیں بھابھی بھی۔ کہاں تو اتنی باتیں اس لڑکے اور لڑکے کے مالک کی اور آج کچھ بھی نہیں۔ کچھ تو بولنا چاہیئے بھابھی کو۔ آخر اس کھڑکی کے پٹ بند کیوں ہو گئے؟ آ گئے جبھی تو......

بھابھی نے کہا "تم نے کچھ سنا.......... وہ چلے گئے؟"

"کون ....؟"

"وہی آنند .... جن کے پاس وہ لڑکا کام کرتا تھا۔ وہ آج آئے اور اپنا سارا سامان لے کر چلے گئے۔ ان کے پتا کا ہارٹ اٹیک ہو گیا .... وہ لڑکا تو بہت رو رہا تھا ...."

پھر اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا اور میں باتھ روم میں چلی گئی۔ کافی دیر بعد باہر نکلی۔ میں نے سوچا میں اس لڑکے کو بلا کر رکھ لوں .... لیکن میں ایسا نہ کر سکی .... منورما کو شکست دینے کے چکر میں خود شکست کھا گئی۔ بس الفاظ کو کھینچ تان کر لائی ہوں۔

اور .... چھوڑو بھی .... سلسلہ ختم ہوا ....

ہاں سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ کتنے ہی سال عمر کی دہلیز پر پھسلتے چلے گئے۔ پھر کیا ہوا کہ آج مجھے تمہارا خط مل گیا۔ خط میں کوئی خاص بات نہیں لیکن آج میں اپنے پتی کو اور اپنے بچوں کو جی بھر کے پیار کروں گی اتنا پیار کہ پورے عمر میں ہو سکے !!

••

روشنی کا درد

وہ راستے میں ملا تو اس کے ہاتھ میں روشنی تھی۔ میں متحیر ہوا کیونکہ پورا شہر تو اندھیروں کی وادیوں میں گم تھا۔ کہیں بھی روشنی کا نام و نشان نہیں تھا۔ پھر اس کے ہاتھ میں روشنی کیسے تھی؟ میں نے اس سے پوچھا "تمھیں یہ روشنی کہاں سے ملی؟"

اس نے جواب نہیں دیا بلکہ روشنی بجھا دی اور پھر مجھ سے سوال کیا "تم یہ بتاؤ کہ روشنی کہاں چلی گئی ہے؟"

ایک لمحے میں اندھیرے کا راج ہو گیا اور اب ہم ایک دوسرے کا چہرہ تک نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"بتاؤ؟" اس نے باغیانہ انداز میں پھر پوچھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے بہت گندا مذاق کر دیا ہو۔ پل بھر میں ہی میں اس کے خلاف بہت کچھ سوچ گیا۔ پھر بھی جب میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کی آواز بھی بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے اپنی گرفت میں لے لوں، لیکن اندھیرا تھا، ہر طرف۔ اندھیرے میں میں کسی بھی صورت میں اس سے بغلگیر ہونا نہیں چاہتا تھا جس نے میرے

وجود کو بہت ہی سفاکی سے نظر انداز کر کے مجھے برہنہ کر دیا تھا۔ اندھیرے میں گناہ کے ہاتھ لمبے ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شخص اب بھی میرے سامنے کھڑا ہو۔ میں پریشان ہوا کہ عالم وجود میں وہ کون سی شے ہے جو ہم سے دور رہ کر بھی ہم سے قریب رہتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا لیکن میرے اس سوال کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا

"اب تو پرماتما بھی ہمارے ساتھ نہیں رہا! نہ جانے اس سنسار کا کیا ہو گا؟"

"اندھیرا سب سے بڑی لعنت ہے۔"

میں نے پھر سوچا "شہر میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے پچھلے دنوں کتنے حادثے ہو گئے۔ مکار لوگوں نے بھولے لوگوں کو کس قدر پریشان کر رکھا ہے!"

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اس سیاہ اندھیرے میں روشنی والے اس شخص کی کس قدر ضرورت تھی؟ لیکن اس نے روشنی بجھا کیوں دی؟ کیا اس پر بھی زمانے کا اثر پڑ گیا تھا؟

اندھیرے میں میرے سامنے بہت سے بے شکل چہرے ابھر رہے تھے طوائفوں کے کوٹھے پر بیٹھ کر اپنی بیویوں کو بے وفا کہنے والے یہ لوگ کون ہیں؟ اندھیرے میں ابھرنے والے بے شکل چہروں کا احساس کر کے مجھے خیال آیا کہ اگر شہر میں روشنی ہوتی تو لوگ ان بدلتے چہروں کو فوراً پہچان لیتے۔ لیکن روشنی کے بغیر تو بائیں ہاتھ کو داہنے ہاتھ کا یقین ہی نہیں رہا۔

"بھائی میرے! میرے قریب تو آؤ!"

"نہیں!"

"کیوں ......؟"

"کیا پتہ تمہارے ہاتھ میں زہر کا پیالہ ہو؟"

"کیا سقراط کو زہر پلانے والا میں ہی تھا؟"

"میں نہیں جانتا!"

"منصور کو میں نے تو نہیں مارا تھا!"

"کیا پتہ ——؟"

"تم مجھ سے ہاتھ تو ملاؤ!"

"مگر اندھیرے میں تو ...."

"اندھیرے میں تو بڑے بڑے سودے ہو رہے ہیں........."

"دیشوں کی قسمتیں بن بگڑ رہی ہیں!"

"میں ... ... مگر میں صرف اپنی حفاظت چاہتا ہوں!"

"لوگ اپنی ہی حفاظت کے لئے سوچیں گے تو دیش ...."

میں اپنے بائیں ہاتھ کو داہنے ہاتھ کے پاس لے گیا۔ دونوں گرم جوشی سے ایک دوسرے سے گلے ملے۔ ابھی تک ان کا آپسی اعتماد قائم تھا۔

"اگر اندھیرا اسی طرح رہا!" میں نے سوچا "پھر تو ......" اس وقت میں نے چاہا میرے دونوں ہی ہاتھ آپس میں ایک دوسرے سے چپکے رہیں لیکن جلد ہی دونوں الگ جیبوں میں چلے گئے۔ اس وقت پھر مجھے اس روشنی والے شخص کا خیال آیا جو اس اندھیرے میں بھی بہادری سے روشنی لئے چلا جا رہا تھا۔ لیکن میرے سوال کرنے سے اسے ہوا کیا؟

"وہ کوئی سیاستداں نہیں ہو سکتا!" میں نے سوچا "یہ لوگ تو شہر میں اندھیرا پھیلا کر خوش ہیں۔ جیسے روشنی میں ان کے چہرے بے نقاب

ہو جائیں گے۔ یہ چہرے بے نقاب ہو کر بے شکل کیوں ہو جاتے ہیں؟"

"وہ کوئی سرکاری افسر بھی تو ہو سکتا ہے!" میں نے پھر سوچا "سرکاری افسر عوام کی خدمت کے لئے ہی تو ہیں۔

اسی وقت کسی نے سرگوشی کی " لیکن اس اندھیرے میں سرکاری افسر تو کہیں نظر نہیں آتے!"

"وہ گھروں میں بھی تو نہیں ہیں!"

"پھر کلبوں یا ہوٹلوں میں ہوں گے؟"

"کیا وہاں روشنی ہے؟"

"وہاں روشنی کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا وہاں روشنی کے بغیر لوگ ...."

"وہاں صرف جسموں کا احساس ہوتا ہے!"

"لیکن کچھ نظر ہی نہ آئے تو!"

"اس سے بڑا اور دان کیا ہو سکتا ہے؟"

سوالوں کے ہجوم نے میرا سکھ چین چھین لیا۔ میں نے سارے جہاں کے لوگوں کو تخیلات میں دیکھا لیکن ان میں وہ روشنی والا شخص کہیں نہیں تھا پھر یکبارگی مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ کوئی ادیب نہ ہو۔ آج کل یہی لوگ ہاتھ میں روشنی لے کر آندھیوں دطوفانوں میں کھڑے ہونے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جیسے کہ انھیں اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ ان سے کہو "میرے بھائی زندگی کے چار دن ملے ہیں۔ سکھ آرام سے گذار لو!"

کہتے ہیں "جب تک اس زمین پر ایک بھی انسان دکھی اور غمگین ہے ہم چین سے نہیں سو سکتے!"

اب کوئی ان کی اس ذہنیت کو کیا کہے .... پتہ نہیں ان کی نگاہیں لوگوں کے دکھ جیتا پر ہی کیوں مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں؟

پھر ایک دن وہی روشنی والا شخص مجھے نظر آیا تو میں اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں روشنی تو نہیں تھی لیکن اس کے اندر سے شعاعیں سی نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس طرح کی روشنی مجھے کسی اور کے اندر نہیں ملی۔ ہاں، پیغمبروں کو چھوڑ دیں تو تاؤں کی بات اور ہے

"آپ کون ہیں؟" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

لیکن اس نے جواب نہیں دیا بلکہ برجستہ مجھ سے سوال کیا "پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

"جی میں ایک قاری ہوں!"

"پھر تم مجھے نہیں جانتے؟"

"جی آپ مجھے کوئی ادیب معلوم ہوتے ہیں!"

"کیسے پہچانا؟"

"آپ کی روشنی سے!"

ادیب چپ رہا۔ وہ ادیب ہی تھا۔ میں نے پھر پوچھا "آپ کے ہاتھ کی روشنی کہاں گئی؟"

"وہ تو اسی دن بجھ گئی تھی!"

"کیوں؟"

"تم نے پوچھا جو تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟"

"اور آپ پریشان ہو گئے!"

"میں امتحان لینا چاہتا تھا!"

"اپنی روشنی بجھا کر......... ؟ لیکن آپ کی پہچان تو آپ کی روشنی سے ہو سکتی تھی.........!"

"تو کیا.......... اب تم مجھے..........؟"

"اندھیرے میں کون کس کو پہچانتا ہے جناب؟"

"تو کیا......... تم بھی.........؟"

"میرا کیا ہے عوام تو.........."

"مگر روشنی میں نے ہی.............." مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آواز بہت دور خلاؤں سے آرہی ہے اور اب پھر ہر طرف اندھیرے کا راج تھا.........

●●

اس کی پسند

آج بھی اس کی میز پر سرخ گلاب رکھا ہوا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گئی۔ اس نے میز کی دراز سے رجسٹر نکال کر کلاس پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی تو دیکھا طلباء ابھی تک اس کے استقبال میں کھڑے ہیں۔ اس نے آہستہ سے کہا "بیٹھ جائیے۔" اور پھر حاضری شروع ہوئی۔ رول نمبر ایک، دو، تین، چار... ... . رول نمبر اکیس... ... ...پتہ چلا کہ صبح کلاس میں ایک جھلک دکھائی دی تھی اس کے بعد کسی نے کالج کیمپس میں نہیں دیکھا۔

پورے پیریڈ لکچر دیتی رہی۔ نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ۔ پل بھر بھی خاموش ہو جانے پر اسے پوری کائنات سرخ گلاب دکھائی دیتی اور اس کے ساتھ ہی سوالیہ نشان؟ کون رکھ جاتا ہے... ... ...اسے میز پر... ... ...؟

قریب دو ماہ سے اس کی میز پر کوئی سرخ گلاب رکھ جاتا ہے۔ اس نے خفیہ طور پر پتہ لگانے کی بھی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ یہ سچ تھا کہ سرخ گلاب اس کی کمزوری تھی جب صرف چھٹی کے دنوں میں اپنے بالوں

میں لگاتی تھی۔ کالج میں ہمیشہ بالوں کی ایک چوٹی بنا کر آتی، بغیر کسی میک اپ کے۔ ہاں اسے سفید کپڑے پہننے کا نشہ سا تھا۔ سفید رنگ کے بعد اگر کوئی رنگ خوش قسمت تھا تو وہ سرخ رنگ! کالج میں جب کوئی فنکشن ہوتا تو وہ سرخ رنگ کی ساری میں نظر آتی، لیکن اس موقع پر بھی وہ سرخ گلاب نہ لگاتی۔ پھر کون اس کی اس پسند کو جانتا ہے؟ کلاس روم میں گلاب پر نظر پڑتے ہی وہ بے چین ہو جاتی لیکن چہرے پر بے نیازی کا نقاب ہمیشہ اسے شرمندہ ہونے سے بچا لیتا۔ کلاس چلتے رہتے، چاک گھستا رہتا سوال و جواب ہوتے رہتے۔ کلاس روم سے باہر نکلتے وقت اس کی یہ خواہش ہوتی کہ لوٹ کر اس گلاب کو اپنی ہتھیلیوں سے سہلائے۔ لیکن اس کا پروفیسر پہریدار کی طرح اس سے چمٹا رہتا۔

لمبی چھٹیوں کے بعد جب وہ پہلے دن کلاس میں آئی تو اس کی دھڑکن جیسے رک سی گئی ہو۔ میز خالی تھا۔ اس پر رکھا سرخ گلاب جیسے کہرے میں چھپ گیا تھا۔ آج وہ حاضری لینا بھول گئی۔ اس نے چاک اٹھایا اور بلیک بورڈ کی طرف بڑھ گئی۔ ایک لمحہ.......... دو لمحہ.......... تیسرا لمحہ .... چاک انگلیوں سے بغاوت کرتا رہا..... .... پھر انگلیاں چل پڑیں۔ مشین کی طرح رفتار پکڑ لی اور وقت کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔

اسے کالج میں پڑھاتے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ دوڑنے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہی بے جان صبح، وہی تھکان بھری شام، وہی راستے اور وہی بس نمبر.... .... کچھ بھی تو نہیں بدلا اور

اور اگر کچھ بدلا ہے تو وہ خود یا اس کا جسم یا اس کے اسٹوڈنٹ۔ ہر سال نئے نئے طلبا ہ آتے رہتے، نئی ہلچل اور نئی امنگیں لئے۔ نئے فیشن اور نئے انداز لئے۔ وہ انھیں دور کھڑی دیکھتی رہتی ایک خاموش تماشائی کی طرح۔ اب دل ان کی طرف مائل ہوتا ہے نہ مایوسی ہی ہوتی ہے۔ وہ یہی سوچتی رہتی اگلے سال پھر نیا میلہ لگے گا لیکن اسے وہی بیچنا ہوگا جسے وہ آٹھ سال سے بیچتی آرہی ہے۔ دوکاندار نہیں بدلتا، گاہک بدل جاتے ہیں۔

اس کے بال جب چاندی کی چند لکیروں کو اپنا ساتھی بنانے لگے تو وہ سرخ گلاب کو ہاتھ میں لے کر للچائی نگاہوں سے دیکھتی رہتی۔ جب آنکھیں تھک جاتیں تو وہ گلاب کو گلدان میں سجا دیتی اور چپ چاپ آنکھیں بند کر لیتی۔ ذہن کے پردے پر وہ میز آجاتی جس پر ایک سال تک مسلسل کسی کا سرخ گلاب کھلتا رہا۔ اور اب ... ... اب اس میز پر رجسٹر کے علاوہ اور کچھ نہ دکھائی دیتا۔

آج اپنا پیریڈ پڑھا کر جب وہ اسٹاف روم میں آئی تو کسی نئے چہرے کو کسی کتاب میں مشغول پایا۔ وہ شخص کتاب میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اسے اس کے آنے کی خبر نہ ہوسکی۔ اس نے بغل میں بیٹھی مسز شرما سے اشارے سے پوچھا۔ جواب میں مسز شرما نے ایک پرچی ہاتھ میں دے دی۔ لکھا تھا "چڑیا گھر کے لئے نیا جانور... ... ... زبان۔ انگریزی... ... ... چہکنا... ... انگریزی ادب پر۔ پچھلے چڑیا گھر کا نام... ... ... ایس دی ڈی۔"

تفصیل پڑھتے ہی اس کے منھ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ اس

نے کتاب سے اپنا چہرہ ہٹایا تو وہ نارمل ہو چکی تھی۔

"نمستے.......... مجھے کے کمار کہتے ہیں New Comer ہوں۔

آپ انگریزی میں ہیں نا!"

"جی ہاں... ... ... لیکن آپ... ... ..."

"معاف کیجئے گا... ... ... یوں ہی اندازہ لگا لیا تھا!"

"اوہ... ... ...!" اور وہ خاموش ہو گئی۔

اس دن گھر لوٹتے وقت اس کے دماغ میں صرف ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ اس چہرے کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟ ... ... بس اسٹاپ پر... ... ... شاید کسی موڑ پر... ... ... یا پھر کسی چوراہے پر... ... ... لیکن یقینی طور پر کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔

وقت گذرتا رہا۔ دیوالی کی چھٹیاں چل رہی تھیں۔ ایک دن اسے کمار کا دعوت نامہ ملا۔ کمار نے اپنی سالگرہ کی پارٹی کسی ہوٹل میں ارینج کی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ ایٹی کیٹ کا تقاضہ تھا۔

اس نے خوبصورت گلاب کا ایک گلدستہ بنوایا۔ جب وہ ہوٹل پہونچی تو پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ کمار نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جواب میں وہ مسکرائی اور گلدستہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "Many happy returns of the day"۔

"Oh thank you miss Uma" "آپ بھی گلاب ہی پسند کرتی ہیں؟ آپ کی پسند لاجواب ہے اور قیمتی بھی۔ آئیے۔"

لوٹتے وقت کمار نے اسے اپنی گاڑی میں لفٹ دی۔ اس نے سکوت توڑنے کے لئے کہا "آپ کی پارٹی بہت اچھی رہی!"

"شکریہ، مس اوما!" کمار نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی اور اس کی طرف دیکھ کر کہا "کئی دنوں سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا... ... ... اگر آپ اجازت دیں تو... ... ..."

"ہاں ... ... ہاں ... ... ضرور پوچھئے!"

"مس اوما! آپ کو وہ لڑکا یاد ہے؟ رول نمبر اکیس۔ جس نے ایک بار آپ سے کلاس میں سوال کیا تھا کہ جارج برنارڈ شا کی محبوبہ اپنی پسندٹ ان سے عمر میں کافی بڑی تھیں اور اس پر آپ ناراض ہو گئی تھیں!"

"میں سمجھی نہیں آپ ... ..."

"یاد کیجئے ... ... اس نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ کیا ہمارے بھارت میں بھی ایسا ہو سکتا ہے... ... ...؟"

اس نے کمار کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا "ہاں... ... ... ایک تھا... ... ... رول نمبر اکیس... ... ... شاید کمل... ... ... اکثر میری کلاس میں دیر سے آتا... ... ... اور ایسے ہی بے مطلب سوال کرتا رہتا... ... ... لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اچھا!... ... ... آپ کی میز پر ایک سرخ گلاب بھی رہتا تھا ... ..."

"ہاں ... ... لیکن ... ...؟"

"جی! آج بھی آپ کے لئے سرخ گلاب لایا تھا!" کہتے ہوئے اس نے گاڑی روک دی۔ اور پچھلی سیٹ سے بڑا سا سرخ گلاب نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میں آج بھی وہی سوال دہرانا چاہتا ہوں... ... ...!"

چھٹیوں کے بعد آج کالج میں کافی چہل پہل تھی۔ وہ بھی جلدی جلدی تیار ہو کر آج کالج چلی آئی تھی۔ آج اس نے بالوں میں سرخ گلاب لگا رکھا تھا۔ سرخ ریشمی ساڑی اس کے جسم پر جیسے مچل رہی تھی۔ اس نے آج اپنے آپ کو اطمینان سے سنوارا تھا۔ اس کے بالوں کی چاندی بھی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

اسٹاف روم میں داخل ہوتے ہی سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ یہ جان کر بھی کہ اسٹاف کے سبھی لوگ اسے گھور رہے ہیں اس نے کسی کا نوٹس نہیں لیا۔ بے پروائی سے الماری کھول کر رجسٹر نکالا اور کلاس کی طرف بڑھ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے سے آئی دبی ہنسی سنی اور اسے اپنا وہم سمجھ کر دماغ سے نکال دیا۔ کلاس میں پہونچ کر حاضری لی۔ پھر عادت کے مطابق چاک اٹھایا اور بلیک بورڈ کی طرف بڑھ گئی .... یہ کیا .... ؟ اس کے پاؤں جیسے زمین سے چپک گئے۔ آج بلیک بورڈ سیاہ نہیں سرخ تھا! اس نے اپنی آنکھوں سے اس سرخ بورڈ کو الفاظ میں بدلتے دیکھا .... لکھا تھا "بوڑھی گھوڑی لال لگام ......"

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی!

دوسرے دن صبح اٹھی تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ نو بج چکے تھے۔ اتنے میں نوکرانی چائے لے کر آ گئی

"بی بی جی! باہر چپراسی آیا ہے۔ کمار صاحب نے آپ کی طبیعت

پوچھی ہے!"

"ہاں! طبیعت پوچھی ہے۔ شکریہ تو کہنا ہی پڑے گا۔ چپراسی کو بٹھا کر چائے پلا دو تب تک میں جواب لکھتی ہوں!"

"جی بہت اچھا!"

ٹیبل پر کاغذ پھیلا کر وہ جیسے ہی لکھنے بیٹھی اس کے سامنے کل کا مرجھایا ہوا گلاب پڑا تھا۔ اس کی پنکھڑیاں کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح بکھری پڑی تھیں ایک طویل سانس لے کر اس نے کاغذ پر کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں، پھر کاٹ دیا۔ پھر کچھ لکھ کر اسے مسل کر پھینک دیا۔ اچانک وہ قلم پھینک کر اٹھ گئی۔ بالوں پر ایک ہاتھ پھیرا اور پرس اٹھا کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

"سلام میڈم جی! کمار صاحب نے طبیعت پوچھی ہے۔ اب آپ کیسی ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہوں کریم! کمار صاحب کو میرا شکریہ ادا کرنا...... ...... اور ہاں ... ... یہ لو پانچ روپئے۔ راستے میں پھول والے کی دوکان سے گلاب کا ایک گلدستہ بنوا لینا اور میری طرف سے کمار صاحب کو دے دینا! ہاں ایک بات کا خیال رہے سبھی گلاب سرخ رنگ کے ہوں صرف سرخ! انھیں سرخ ہی گلاب پسند ہیں!!"

••

Published by :—

NIKHAR PUBLICATIONS

MAUNATH BHANJAN (U. P.) 275 101

Price Rs. 15/-